قرآن کریم اور سنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۱ شمارہ: ۱

محرم الحرام: ۱۴۳۹ھ - اکتوبر: ۲۰۱۷ء

قیمت فی شمارہ: ۳۵ روپے، زرِ سالانہ: ۴۰۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول

مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

نائب مدیر

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون

مولانا محمد اعجاز مصطفی

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ
انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا
وغیرہ: 27 امریکی ڈالر

بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

فہرستِ مضامین

بصائر وعبر

روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی کیوں؟	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

سن ہجری!	۱۱	مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ
لامذہبیت کا فتنہ لادینیت پر جاکر ختم ہوتا ہے!	۱۴	مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ
مکاتیب علامہ کوثریؒ... بنام... علامہ بنوریؒ (قسط:۷)	۱۷	ترجمہ: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
انشورنس کی اسلام کاری! نیا اور پرانا طرز	۲۰	مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
جہنم میں لے جانے والے گناہ!	۳۷	ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی
اورنگ زیب عالمگیرؒ، تاریخ کا مظلوم حکمراں	۴۲	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
’’شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا‘‘ اور اُن کا حکم (قسط:۱)	۵۱	مولانا انعام اللہ

یادِ رفتگاں

جامعہ کے استاذ حضرت مولانا مفتی محمد نیازؒ کی رحلت	۵۸	محمد اعجاز مصطفیٰ

دار الافتاء

’’کوشر‘‘ یہودی کھانا	۶۱	ادارہ

نقد ونظر

	۶۳	ادارہ

روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی کیوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

مغربی استعمار اور اس کے ہمنوا ایک عرصہ سے مسلم ممالک میں انتشار، خلفشار اور نقصِ امن کی صورت حال پیدا کرکے اُنہیں عدمِ استحکام سے دوچار کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ افغانستان، عراق، لیبیا، تیونس، الجزائر، یمن اور شام جیسے ممالک ان کی واضح مثالیں ہیں، بلکہ اب تو یوں لگتا ہے کہ اس کی لڑائی صرف مسلم ممالک تک محدود نہیں، بلکہ جہاں بھی مسلمان رہتے ہیں اور اس خطہ سے استعمار کے مفادات وابستہ ہیں تو وہاں بھی وہ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر، اُنہیں زندہ جلاکر اور ان کی بستیوں کو خاکستر کراکر مسلمانوں کو وہاں سے بے دخل کررہا ہے۔

برما حکومت بظاہر بدھسٹ مذہب کی پیروکار ہے اور اس کے مذہب میں انسانی قتل تو دور کی بات ہے، بلکہ کسی ذی روح جاندار کو مارنا بھی ظلم سمجھا جاتا ہے، لیکن آج وہاں کی افواج اور بدھ مت کے پیروکار شدت پسند' روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام کررہے ہیں۔ فورسز کی جانب سے برمی مسلمانوں کے سر قلم کیے جارہے ہیں، اُن کے اعضاء کاٹ کر اور اُنہیں اذیتیں دے دے کر موت کے گھاٹ اُتارا جارہا ہے، زندہ انسانوں پر پٹرول چھڑک کر اُنہیں آگ کے منہ میں ڈالا جاتا ہے اور ان کی لاشوں کو جلاکر راکھ کیا جارہا ہے۔ یہ صرف اب مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا، بلکہ انسانیت کی تذلیل کی بدترین مثال دنیا کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

ابتداءً الیکٹرانک میڈیا خاموش تماشائی بنا ہوا تھا، لیکن جب روہنگیا کے مظلوم مسلمانوں پر ظلم وبربریت، ان کے قتل اوران کے جلانے کی تصاویر اور ویڈیوز سوشل میڈیا پر آنے لگیں تو ان کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا اور اس میڈیا کی چھلنی سے چھن چھنا کر جو خبریں باہر آرہی ہیں‘ ان کے پڑھنے اور سننے سے ہی ایک عام انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

برطانوی میڈیا کے مطابق ’’مقامی افواج اور شدت پسندوں نے مسلمانوں کے قتل عام کے بعد شواہد مٹانے کے لیے لاشوں کو جلانا شروع کردیا ہے۔ روہنگیا مسلمانوں کے خلاف تشدد کی نگرانی کرنے والے ایک گروپ کے وکیل ’’کریں لیوا‘‘ کے مطابق رتھیڈ ونگ کے ایک علاقے میں ۱۳۰ مسلمانوں کو بے دردی سے شہید کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ تین دیگر دیہاتوں میں بھی درجنوں افراد کو قتل کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ سیکورٹی فورسز مسلمان اکثریتی دیہاتوں کو گھیرے میں لے کر اُنہیں اندھا دھند گولیوں کا نشانہ بنارہی ہیں، جب کہ ان سفاکانہ کارروائیوں میں بدھ مت کے شدت پسند اُن کے ساتھ مل کر کام کررہے ہیں۔‘‘ (روزنامہ جنگ کراچی، ۵رستمبر۲۰۱۷ء)

اس ظلم وستم، قتل وقتال اور آگ وبارود سے بچ کر جو لوگ وہاں سے نکلنے میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں تو قریب ترین اسلامی ملک بنگلہ دیش میں پناہ کی تلاش میں آتے ہیں تو آسانی سے ان کو بنگلہ دیش میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ترکی کے موجودہ صدر جناب طیب اردگان کو جنہوں نے اُمتِ مسلمہ کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرتے ہوئے واضح انداز میں بنگلہ دیش کو کہا ہے کہ آپ اُنہیں اپنے ملک میں پناہ لینے دیں، ان کے تمام اخراجات ترکی حکومت برداشت کرے گی۔ مزید یہ کہ ان مظلوم مسلمانوں کی اَشک شوئی اور انہیں حوصلہ دینے کے لیے اپنی اہلیہ کو بھی امدادی ٹیم کے ساتھ روانہ کیا۔ اس پر انہیں جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے‘ کم ہے۔

الحمدللہ! ادھر پاکستانی حکومت اور عوام نے بھی ہر سطح پر صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ صوبائی اسمبلیوں، قومی اسمبلی اور سینیٹ میں بھی ان روہنگیا مظلوم مسلمانوں کے حق میں قرارداد یں پاس کی گئی ہیں اور برما حکومت کی فورسز اور شدت پسندوں کے ان مظالم کی مذمت کی گئی ہے۔ قومی اسمبلی میں برما کے ان مظلوم مسلمانوں کے حق میں سب سے مؤثر اور توانا آواز جمعیت علمائے اسلام کے امیر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے بلند کی ہے، آپ نے قومی اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

’’جناب اسپیکر! آج پوری قوم کے لیے اور ہمارے اس ایوان کے لیے نہایت اہم دن بھی

ہے اور ایسے وقت میں جبکہ برما میں صوبہ اراکان کے روہنگیائی مسلمانوں پر ایک آزمائش ٹوٹ پڑی ہے، مجھے یاد ہے کہ پانچ سال قبل اسی ایوان میں‘ میں نے ایوان کو متوجہ کیا تھا، اس وقت ملک میں مکمل خاموشی تھی اور کسی سطح پر وہاں کے مظالم کا نوٹس نہیں لیا جارہا تھا، آج بہرحال اس حد تک تو بات قابلِ اطمینان ہے کہ پورے ملک میں ہر سطح پر ہر شعبۂ زندگی سے وابستہ لوگ روہنگیائی اراکانی مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کررہے ہیں اور یہ ان کا ہمارے اوپر حق بھی ہے۔

پوری اُمتِ مسلمہ آزمائش سے گزر رہی ہے۔ نائن الیون سے لے کر آج تک افغانستان، عراق، لیبیا، شام، صومالیہ، مالی، یمن اور پاکستان اور اس کے بعد اب میانمار کی صورت میں جہاں جہاں مسلمان ہیں‘ وہاں وہاں آگ برس رہی ہے اور اُمتِ مسلمہ خون کے دریا عبور کررہی ہے۔

جنابِ اسپیکر! سب کے جذبات یکساں ہیں، میں جو ابھی اسمبلی کے اجلاس میں آرہا تھا تو مجھے اپنے ساتھی جناب سینیٹر طلحہ محمود صاحب کا وائس میسج ملا جو’’کاکس بازار‘‘ تک پہنچے ہیں اور اس سے آگے بنگلہ دیش کی سرحد پر جو پناہ گزین پہنچے ہوئے ہیں، انہوں نے وہاں کی حالتِ زار کا جو نقشہ اپنے الفاظ میں کھینچا، یقین جانئے کہ وہ زبان پر لانے کے قابل نہیں ہے۔ لاکھوں لوگ اس وقت بے گھر ہوچکے ہیں، دیہاتوں کے دیہات جلادیئے گئے ہیں۔ خواتین، بچے ان کے جسموں کو جس طرح درختوں کے ساتھ لٹکایا گیا ہے، ان کے اعضاء جس طرح کاٹے گئے ہیں، یقین جانئے کہ دنیا میں مسائل پیدا ہوتے ہیں، ہر ملک کے اندر کے مسائل کے کچھ عوامل بھی ہوا کرتے ہیں، لیکن آج بہرحال برما کے مظالم کا نقشہ انسانیت کا مسئلہ بن گیا ہے، انسانی حق کا مسئلہ بن گیا ہے اور اس طرح انسانیت کی تذلیل ہورہی ہے، جس طرح انسانیت وہاں رسوا ہورہی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اگر آج یہاں کوئی ایک واقعہ ہوجائے تو ہمارا میڈیا بھی آسمان سر پر اُٹھالیتا ہے، پورا یورپ بھی آسمان سر پر اُٹھالیتا ہے، پورا امریکہ بھی آسمان سر پر اُٹھالیتا ہے۔ مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کرتے۔ اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا، ان کی غلط تصویر پیش کرنے کے لیے ایک واقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ آج وہاں لاکھوں انسان دربدر ہیں، ہزارہا انسانوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے کردیئے گئے ہیں، ہماری ماؤں، بہنوں، خواتین کی عصمت دری ہورہی ہے، سرِعام ان کو کلہاڑوں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا جارہا ہے، خون دریا بن چکا ہے اور دریائے ناف کو عبور کرکے جب پہاڑوں میں آتے ہیں تو پہاڑوں میں وہاں ان کے کھانے کے لیے صرف درختوں کے پتے ہوتے ہیں، بڑے تو پتے کھالیتے ہیں، لیکن ان کے بچے بلک بلک کر ان کی آنکھوں کے سامنے مرجاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں کہاں گئی وہ انسانیت؟ کہاں گئے وہ انسانی حقوق کے علمبردار؟ کس بل میں جاکر گھس گئے ہیں یہ لوگ؟ کیوں ان کی

زبانیں آج گنگ ہوگئی ہیں؟ کیوں آج ان کو یہ انسانیت نظر نہیں آ رہی ہے؟

میں ایوان کے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں جناب اسپیکر! کہ برما کے اراکان صوبہ کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے اور آج جس حالت میں وہ ہیں‘ برما کی حکومت نے باقاعدہ ایک قانون کے ذریعہ پورے صوبہ کے مسلمانوں کی شہریت ختم کردی ہے، اور اس وقت اراکان کی تمام آبادی جو بارہ لاکھ تک پہنچتی ہے‘ وہ اسٹیٹ لیس ہیں۔ اس طرح بے سہارا کوئی نہیں۔ ایک پورے صوبہ کو اور صوبہ کی پوری آبادی کی شہریت ختم کردی گئی ہے۔ پورا صوبہ اس وقت اس کا کوئی ملک نہیں ہے اور ان کی فوج ہے کہ آج ان انسانوں کو جن کو وہ برما کا شہری تسلیم نہیں کرتے، ان کو تہہ تیغ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ نسل ختم کردی جائے اور اراکان کی زمین پر قبضہ کرلیا جائے۔ کتنی افسوس ناک صورت حال ہے! کیا کوئی نوٹس لے رہا ہے اس بات کا؟ کیا کسی کو اس بات کا احساس ہے؟

میں سمجھتا ہوں ہم دنیا کو بعد میں پکاریں، ہم اپنے ملک کو پکاریں، ہم اپنی حکومت کو پکارتے ہیں، ہم اپنے اربابِ اقتدار کو پکارتے ہیں، اپنی پارلیمنٹ کو پکارتے ہیں، اپنی مقتدر قوتوں کو پکارتے ہیں کہ آئیں! خدا کے لیے! آپ ہماری آواز بن جائیں، آپ ۲۱ رکروڑ یا ۲۲ رکروڑ پاکستانیوں کی آواز بن جائیں۔ میں آج یہ بات اپنے اس وطن عزیز سے کررہا ہوں، اس مملکتِ خداداد سے کررہا ہوں جس کی بنیاد دوقومی نظریہ پر رکھی گئی ہے۔ اگر ہندو کے مظالم کے نتیجہ میں پاکستان کا ٹکڑا حاصل کرنا ناگزیر تھا، اسی تصور، اسی نظریہ، اسی اصول کی بنیاد پر برما کے بدھسٹوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی یہ تذلیل‘ کیا وہاں اراکانی مسلمانوں کی آزاد ریاست کا تقاضا نہیں کررہی؟ ایک مسئلہ ہے یہ۔ اس پر غور کرنا ہوگا ہمیں۔

کہیے جی! دہشت گردی کی بات ہے، دہشت گردی تو پاکستان میں بھی رہی ہے، لیکن وہ جنگ عوام کے ساتھ تو نہیں تھی، لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ضرور ہوئے، لیکن آئی ڈی پیز کی صورت میں ان کو ایک پاکستان کے شہری کی حیثیت سے محترم تصور کیا گیا۔ ایک حکمت عملی تھی، کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے، بوجوہ مجھے بھی اس پر تحفظات رہے ہیں، لیکن آج وہ گھروں کو واپس جارہے ہیں، صرف دہشت گردوں کو تنہا کرنے کے لیے۔ لیکن وہاں پر اگر شکایت دہشت گردوں سے ہے یا کسی دہشت گرد تنظیم سے ہے، لیکن اس کی سزا پوری قوم کو کیوں دی جارہی ہے؟ پوری کمیونٹی کو کیوں دی جارہی ہے؟ کیا یہ کہیں دنیا میں انصاف کا تقاضا ہے؟

میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ برما کی وزیراعظم آن سنگ سوچی انسانی حقوق کی علم بردار بھی رہی ہے، برما میں انسانی حقوق اور جمہوری حکومت کے قیام کے لیے اس کو اس جدوجہد کے نتیجہ میں نوبل انعام بھی دیا گیا، آج جب وہ ملک کی وزیراعظم بن گئی، اقتدار اس کے ہاتھ میں آگیا، آج اسی کی

حکومت اور اسی کی فوج کے ہاتھوں پورے مسلمانوں کی نسل کشی ہورہی ہے، انسانیت کا قتل ہورہا ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ جن عالمی اداروں نے ان کو نوبل انعام دیا تھا، وہ نوبل انعام اس سے چھین لیا جائے اور اس کو اس اعزاز سے محروم کردیا جائے، کیونکہ وہاں جو صورت حال ہے، اس صورتِ حال کے نتیجہ میں وہ اس کی حق دار نہیں ہے کہ وہ اس اعزاز کو مزید برقرار رکھ سکے۔

بنیادی مسئلہ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ اگر سی پیک کی صورت میں پاکستان چین کے اقتصادی ویژن کا پہلا زینہ بنا ہے تو اب پاکستان نشانہ پر ہوگا۔ یہاں سیاسی بحران اب پیدا کیے جائیں گے، عدم استحکام پیدا ہوگا اور عدم استحکام کے لیے آغاز ایک سیاسی بحران سے کرنا چاہے گا۔ مجھے اس سارے مسئلہ میں کرپشن اور نواز شریف کی حکومت کا بچنا اور نہ بچنا' نظر نہیں آرہا، بلکہ مجھے پاکستان ایک بحران کی طرف اور سیاسی عدم استحکام کی طرف جاتا نظر آرہا ہے۔

آپ نے دیکھا اس فیصلہ کے بعد ٹرمپ نے جو پاکستان کو پیغام بھیجا، اس پیغام سے کیا یہ حقیقت سامنے نہیں آئی کہ وہ اس واقعہ کے بعد پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کرنا چاہتا تھا؟! مجھے خوشی ہے کہ نائن الیون میں جہاں ہم جنرل مشرف کے اس فیصلہ کے خلاف تنہا نظر آرہے تھے، آج ہم تنہا نہیں ہیں، امریکہ کے حوالہ سے پوری قوم کی آواز ایک ہے۔

کسی زمانہ میں اسی ایوان میں' میں نے برما کے حوالہ سے تنہا بات کی تھی، آج مجھے خوشی ہے کہ آج ملک کا ہر طبقہ پورا ایوان ایک آواز میں بات کررہا ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جو سی پیک کی صورت میں موٹروے پاکستان سے گزر رہا ہے، چائنا سے تبت اور بنگلہ دیش کے راستہ سے برما کی طرف بھی منصوبہ ہے اور عرب دنیا میں تیل بعد میں برآمد ہوا، ۱۸۵۳ء میں تیل برما کے اندر نمودار ہوا، اور معدنی وسائل کے سب سے بڑے ذخائر برما کے اندر ہیں اور اگر ون بیلٹ ون روڈ کے فلسفہ کے تحت برما کی طرف روڈ جائیں گے تو وہاں کے حالات آج جس نہج پر پہنچ گئے ہیں' صاف نظر آئے گا کہ اس کے پیچھے کس کا فلسفہ ہوسکتا ہے اور کونسی قوت ہے جو وہاں اس قسم کے حالات پیدا کرنا چاہتی ہے۔ ہم خود اس سے دوچار ہیں تو بہتر طور پر تجزیہ کرنے کی ہمارے اندر صلاحیت ہے کہ دنیا کو کہاں لے جایا جارہا ہے اور اس میں نشانہ صرف مسلمانوں کو بنایا جارہا ہے، تو اس پہلو کو بھی ہم نظر انداز نہیں کرسکتے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ برما کے ساتھ چائنا کے بھی بہت اچھے تعلقات ہیں، چائنا گورنمنٹ کے ساتھ، برما کے ساتھ پاکستان کے بھی ملٹری ریلیشن بہت اچھے رہے ہیں اور ہیں۔ ہم خطہ میں اس تعلق کو اپنے مسلمان بھائیوں کے مفاد میں کیسے استعمال کرسکتے ہیں؟ اس کے لیے ہماری اسٹریٹجک پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ اس کے لیے ہماری ڈپلومیٹک پالیسی کیا ہونی چاہیے؟ اس حوالہ سے پاکستان کی ذمہ داری

ہے کہ ہم اپنا کردار ادا کریں، ہماری آواز ہونی چاہیے۔

آج بنگلہ دیش بے گھر لوگوں کو بے وطن لوگوں کو راستہ نہیں دے رہا ہے۔ پہاڑوں میں، صحراؤں میں پڑے ہیں، خیمہ تک نہیں ہے وہاں پر، کیا ہماری حکومت اس پوزیشن میں نہیں کہ کم از کم اس موسم میں جو وہاں بارش برس رہی ہو اور کھلے آسمان تلے بچے بلک رہے ہوں، ان تک ہم کوئی سایہ نہیں پہنچا سکتے؟ کوئی سائبان نہیں پہنچا سکتے؟ کیا ہم وہاں ان کے لیے کھانے کا انتظام نہیں کر سکتے؟ مجھے جو پیغام آ رہا ہے' وہ یہ ہے کہ: بنگلہ دیش کی حکومت بھی وہاں کسی خیراتی اور رفاہی ادارہ کو کام کرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہے، مشکلات پیدا ہو رہی ہیں، اس حوالہ سے پاکستان کو بطور ایک اسٹیٹ کے، خطہ کے ایک اہم کردار کے اپنا ایک کردار ادا کرنا ہوگا۔ اور پارلیمنٹ آج اپنی حکومت سے ذرا زور دے کر یہ کہے، تاکہ ہم کل سے اس پر اپنا کام شروع کریں اور ہم رابطے بڑھائیں اور بین الاقوامی سطح پر ہم ہر فورم پر اپنی آواز کو بلند کریں۔

او.آئی.سی کا اجلاس ہو چکا ہے۔ او.آئی.سی سے کوئی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ او.آئی.سی خود آئی سی یو میں ہے۔ ہمیں اردگان کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اردگان نے کہا ہے کہ بنگلہ دیش والو! اگر تمہارے اوپر بوجھ ہے تو تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے۔ اردگان کی اہلیہ پہنچ چکی ہے وہاں پر۔ جو ہمارا حق تھا' وہ کوئی اور ادا کر رہا ہے۔ جو ہم نے کرنا تھا' وہ کوئی اور کر رہا ہے۔ تو ان حالات میں ہمیں سوچ سمجھ کر اپنے اقدامات کی طرف جانا ہوگا۔............ ہم کسی ملک کے داخلی معاملات کی بات نہیں کر رہے، لیکن یہ بات ضرور کر رہے ہیں کہ جب انسانیت کا قتل عام ہوگا، پوری دنیا میں اس پر ایک تشویش ہونی چاہیے، ایک اضطراب ہونا چاہیے، ایک ہیجان ہونا چاہیے، اس پر ایک گفتگو ہونی چاہیے۔

تو یہ میری کچھ گزارشات ہیں کہ اس حوالہ سے ایک گفتگو کے بعد ایک جامع اور مضبوط قسم کی قرارداد ہو، یہ نہ ہو کہ بس نشستند، گفتند و برخاستند اور بس ایک روٹین کی قرارداد پاس کی، نہیں! حکومت کو پابند کرنا ہوگا کہ وہ فوری اقدامات کرے اور آج سے نہیں تو کل سے اس کے اقدامات کا آغاز ہو جانا چاہیے۔ اسٹریٹیجک لیول پر بھی اور سفارتی لیول پر بھی اور انسانیت کی بنیاد پر وہاں تک امداد پہنچانے کے لیے فوری اقدامات کی ہمیں ضرورت ہوگی۔ عالمی اداروں کو ہمیں جھنجھوڑنا ہوگا، ان کو بیدار کرنا ہوگا اور ان کے مرے ہوئے احساس کو اجاگر کرنا ہوگا۔ عالمی ضمیر جو اس وقت نیند میں خراٹے مار رہا ہے' اس کو جگانا ہوگا۔ یہ کردار پاکستان نے ادا کرنا ہے، ان شاء اللہ! قوم سڑکوں پر ہے، قوم بول رہی ہے، اس وقت دنیا کے سوممالک کا سوشل میڈیا بول رہا ہے، لیکن ہمارا جو الیکٹرانک میڈیا ہے جو

ملک کی ریاستی پالیسیوں کے تحت چلتا ہے، وہ ابھی وہ حق ادا نہیں کررہا ہے اس حوالہ سے ۔ اس کو وہ حق ادا کرنا ہوگا! پرنٹ میڈیا کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا! پارلیمنٹ کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا! میرے خیال میں یہ حساس مسئلہ ہے اور اس حساس مسئلہ پر کوئی اختلافِ رائے نہیں ہے، لیکن جاندار گفتگو ہونی چاہیے اور جاندار طریقہ سے ہمیں اپنے اقدامات کو آگے لے جانا چاہیے ۔ اللہ کرے کہ ہم ایک مضبوط قسم کے اقدامات کا فیصلہ کرسکیں اور آنے والے مستقبل کو، اپنے مستقبل کو بھی محفوظ کرنا ہے اور عالم اسلام کے دوسرے مظلوم مسلمانوں اور بالخصوص اس وقت جو روہنگیا اراکان کے مسلمان ہیں، ان کو بھی تحفظ دینا ہے ۔ اس کے بغیر شاید ہم مسلمان ہونے اور اپنے عقیدے اور اسلام کا حق ادا نہیں کرسکیں گے ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو ۔''

بالکل بجا فرمایا کہ: آج روہنگیا کے مظلوم مسلمانوں کے حق میں ''انسانی حقوق'' کے نام نہاد اداروں کی آوازیں گنگ ہیں، انہیں نہ یہاں دہشت گردی نظر آتی ہے، نہ شدت پسندی نظر آتی ہے اور نہ ہی انسانیت کا کوئی مسئلہ نظر آرہا ہے، اس لیے کہ مرنے والے مسلمان ہیں ۔ اگر مسلمانوں کے علاوہ کسی اور کا مسئلہ ہوتا تو فوراً اقوام متحدہ بھی اور دوسرے تمام ادارے متحرک ہوجاتے اور انہیں آزاد ملک اور آزاد وطن دلانے کے علاوہ کسی قیمت پر راضی نہ ہوتے ۔ یہ ہے ان اداروں کا دوہرا معیار!

دوسری بات جو مولانا نے فرمائی کہ: اب خدانخواستہ ہمارے پیارے ملک پاکستان کی طرف ان کی گندی نظریں لگی ہوئی ہیں، حالیہ حکومتی عدم استحکام اور بظاہر اداروں کے ٹکراؤ کا تأثر پیدا کیا جانا اس پالیسی کا حصہ ہی نظر آتا ہے ۔ اس صورت حال میں چاہے وہ مذہبی جماعتیں ہوں یا سیاسی جماعتیں، صاحبانِ اقتدار ہوں یا عوام الناس، ہم میں سے ہر ایک کی ذمہ داری اور فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے ملک پاکستان کی حفاظت اور استحکام کے لیے شش جہت اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور اپنی صفوں میں کسی ایسے آدمی کو نہ گھسنے دیں جو دشمن کا آلۂ کار بن کر پاکستان کے لیے نقصان کا باعث بنے ۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ آج اگر پاکستان میں امن اور استحکام ہے تو یہ امن اور استحکام کافی قربانیوں کے بعد ہم سب کو حاصل ہوا ہے اور دشمن نہیں چاہتا کہ پاکستان میں امن اور استحکام ہو، اس کی کوشش ہوگی کہ کسی طرح ان کے اندر فتنہ وفساد اور لڑائی جھگڑے دوبارہ شروع ہوں ۔ بہرحال جس استعمار کو اپنے مفادات کے لیے مسلمانوں کا خون پینے اور بہانے کا چسکا لگ چکا ہے، اس سے ہر وقت محتاط اور ہوشیار رہنا بہت ضروری ہے ۔

ہم ایک بار پھر مطالبہ کرتے ہیں کہ: اقوامِ متحدہ برما کے مظلوم و بے کس مسلمانوں پر تاریخ کے بدترین ظلم کے خاتمہ کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور اس ظلم کو بند کروائے ۔

۲:...... برما کے ساتھ چونکہ اسلامی ملک بنگلہ دیش کا بارڈر لگتا ہے، اس لیے برمی مسلمان

ہجرت کرکے بنگلہ دیش میں پناہ لینا چاہتے ہیں، لیکن بنگلہ دیش کی حکومت انہیں اپنے ملک میں داخل ہونے نہیں دے رہی، جس سے ہجرت کرکے بنگلہ دیش آنے والے برمی مسلمانوں کو سخت اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم بنگلہ دیش حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مشکل کی اس گھڑی میں برمی مسلمانوں کا ساتھ دیں اور پناہ حاصل کرنے والوں کو پناہ دیں۔

۳:......مساجد کے ائمہ کرام اپنے جمعہ کے خطبہ میں برما کے مسلمانوں پر جوظلم وستم ڈھایا جارہا ہے، اس سے عوام کو آگاہ کریں۔

۴:...... پاکستان کی تمام مذہبی جماعتیں ایک قیادت پر متحد اور مجتمع ہوں، اس سے جہاں پاکستان میں دینی ذہن اور سوچ رکھنے والی عوام اکٹھے اور ایک بھاری قوت ثابت ہوگی، وہاں پوری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی اس سے تقویت اور ایک سہارا ملے گا۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم انفرادی طور پر محنت اور کوشش کرتے ہیں، لیکن قیادت نہ ہونے کی بنا پر ہماری تمام تر کوششیں بے ثمر اور لاحاصل رہتی ہیں۔

ہم حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے سفارتی ذرائع استعمال کرتے ہوئے برما کے مسلمانوں کی مدد ونصرت کرے اور دوسرے اسلامی ممالک کو بھی اس طرف متوجہ کرے۔

پاکستانی مسلم عوام سے بھی درخواست ہے کہ برما کے ان مظلوم مسلمانوں کے حق میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعائیں بھی کریں اور دامے، درمے، قدمے، سخنے ان کی مدد ونصرت بھی کریں۔

مسلمانوں سے بھی ایک گزارش ہے کہ ہم میں ہر ہر فرد اپنے اعمال درست کرے، اپنے اللہ تعالیٰ سے اپنا رابطہ مضبوط بنائے، عبادات کے ساتھ پختگی اور اخلاص کے ساتھ عمل پیرا ہو، گناہوں سے کنارہ کشی اور توبہ واستغفار کو اپنا وظیفہ بنائے۔ ان شاء اللہ! اس سے اللہ تعالیٰ کی مدد متوجہ ہوگی اور مسلمانوں کے حالات درست ہوں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ روہنگیا کے مظلوم مسلمانوں کی مدد فرمائے، ان کے مسائل اور مصائب کو حل فرمائے، مسلمانوں کو اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں کی مدد ونصرت کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان کو مزید مستحکم فرمائے۔ پاکستان کے امن اور استحکام کے لیے محنت کرنے والوں اور قربانی دینے والوں کو اپنے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے۔ ہمارے پیارے ملک پاکستان کو حاسدین کے حسد، شریروں کے شر اور فتنہ پروروں کے فتنوں سے محفوظ فرمائے، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

سنِ ہجری!

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ

محرم الحرام سے نئے سال کا آغاز ہوتا ہے، گویا ہجرتِ نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے اب تک زمانہ گردشِ ایام کی تیرہ سو بانوے منزلیں طے کر چکا ہے، اور آج سے ٹھیک آٹھ سال بعد زمانہ صد سالہ کروٹ بدل کر چودھویں صدی میں منتقل ہو جائے گا۔ صدی کا آخری حصہ عموماً تنزل وانحطاط کا دور ہوتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں اُمت جن حوادث سے دوچار ہوئی، انسانی قدریں جس تیزی سے پامال ہوئیں، انسانیت کے آلام ومصائب میں جس سرعت سے اضافہ ہوا اور ملتِ اسلامیہ پر ابتلاء وآزمائش کے جو پہاڑ ٹوٹے، اگر آئندہ آٹھ سالوں میں پستی وتنزل کی یہی رفتار رہی تو نہیں کہا جاسکتا کہ چودھویں صدی کے اختتام تک دنیا انحطاط کے کس نقطہ تک جا پہنچے گی۔ بظاہر یہ آٹھ سال شدید فتنوں اور آزمائشوں کے سال ہوں گے جن کا نقشہ شاید وہ ہوگا جو صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آتا ہے:

’’بادروا بالأعمال فتناً کقطع اللیل المظلم یصبح الرجلُ مؤمناً ویمسی کافراً ویمسی مؤمناً ویصبح کافراً، یبیع دینه بعرضٍ من الدنیا۔‘‘ (مشکوٰۃ، ص:۴۶۲)

ترجمہ: ......’’ان فتنوں سے پہلے جو شبِ تاریک کے تہ بہ تہ ٹکڑوں کی مانند ہوں گے، اعمال میں سبقت کرو، ان میں آدمی کی یہ حالت ہوگی کہ صبح کو مومن ہوگا اور شام کو کافر اور شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر اُٹھے گا۔ دنیا کے معمولی مفاد کی خاطر اپنا ایمان بیچتا پھرے گا۔‘‘

بعض روایات کے مطابق اس اُمت کی طبعی عمر ایک ہزار سال تھی، اس کے بعد سے اُسے ضعفِ پیری کا عارضہ لاحق ہوا اور وہ بتقاضائے عمر شدید امراض کا شکار ہونے لگی، تاہم مصلحین ومجددین کی گرمیِ دل اور سوزشِ باطن اس کو بہترین غذا پہنچا رہی تھی اور خود اُمت کے باطن قویٰ امراض وآلام کا دم خم رکھتے تھے، مگر اب تو اس کے تمام اعضاء شل اور باطنی قویٰ ماؤف ہو چکے ہیں، اس کی قوتِ مدافعت جواب دے چکی ہے۔ اب یہ اُمت فتنوں کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر کھڑا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، بلکہ ہر موقع پر طوفان کے رُخ بہنے کی خوگر ہو چکی ہے۔ ادھر اس کے اطباء ومعالجین

اس مریضِ جاں بلب کی غلط چارہ سازی میں مصروف ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کا کیا کیا جائے؟! کہیں جمہوریت کے انجکشن سے اس کی بحالیِ صحت کی امید کی جارہی ہے، کہیں یہودیت ومغربیت کے تریاق کو اس پر آزمایا جارہا ہے، کہیں سائنس اور مادیت کے کیپسول اس کے حلق سے اُتارے جارہے ہیں، کہیں سوشلزم کے مارفیا سے اُسے چند لمحے تسکین دلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مگر صد حیف کہ یہ برخود غلط معالجین نہ اس اُمت کے ''مزاج شناس'' ہیں، نہ اس کے مرض اور اسبابِ مرض کی تشخیص کرپائے ہیں، نہ اس کے علاج کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے میں یہ مریض مرے گا نہیں تو اور کیا ہوگا؟! وَکَانَ أَمْرُ اللّٰہِ قَدَراً مَّقْدُوْراً۔

جن فتنوں کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ان کا آخری نقطہ دجالِ اعور (کانے دجال) کا فتنہ ہوگا۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق کو پیدا کیا ہے دجال سے بڑا کوئی فتنہ آیا نہ آئے گا۔ یہ تمام فتنے جو آچکے ہیں یا آئیں گے گویا دجالِ اعور کے فتنۂ کبریٰ کے لیے زمین تیار کررہے ہیں۔ دجال کا فتنہ کب برپا ہوگا؟ اس کا صحیح علم تو علیم وخبیر ہی کے پاس ہے، مگر نقشہ کچھ ایسا بن رہا ہے کہ شاید اب وقت زیادہ نہیں، یہ فتنہ مومن وکافر اور خبیث وطیب کے درمیان امتیازی لکیر ثابت ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے کہ: ''جو شخص ہر جمعہ کو سورۂ کہف پڑھا کرے وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا''۔ (مستدرک حاکم) ہر مسلمان کو اس کی فکر کرنی چاہیے، ہر جمعہ کو سورۂ کہف پڑھنے کا خود بھی التزام کریں، گھر میں بیوی بچوں سے بھی اس کی پابندی کرائیں اور اپنے تمام متعلقین، دوست احباب اور عام مسلمانوں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ حضرات علماء کرام اس سورت کا درس دیں اور اس کے مضامین کی مسلمانوں کو تربیت دیں۔ اس سورت کی مرکزی دعوت یہ ہے کہ ایک مسلمان میں کم از کم اصحابِ کہف کا سا جذبۂ ایمان پیدا ہونا چاہیے کہ ماسوا اللہ کی ہر دعوت کو ''شطط'' (بیہودہ بات) کہہ کر ٹھکرادے اور وقت آنے پر خویش، اقرباء اور گھربار کو تج کر اللہ کے نام پر کسی گوشۂ گمنامی کی طرف ہجرت کرجائے۔ دنیا کی رنگارنگی کا سبز باغ اس کے عقیدہ وایمان کو متزلزل نہ کرسکے۔ اس کے نزدیک آخرت کی ''باقیات صالحات'' کے مقابلہ میں متاعِ دنیا کی تمام رعنائیاں اور دل فریبیاں ذرۂ بے مقدار سے بڑھ کر حقیر وذلیل ہوں۔ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ آخرت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر صرف دنیا کے لیے مرنے کھپنے والے احمقوں کا ٹولہ ہیں، جن کے ہاتھ حسرت وبربادی اور خسارہ ونقصان کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

امن وامان کے عام حالات میں ایک سپاہی کو مقررہ وظیفہ دیا جاتا ہے، مگر جب چاروں طرف بغاوت اور شورش کے شعلے بھڑک اُٹھیں اور حکومتِ وقت سے سرکشی وسرتابی کی فضا عام ہوجائے، اس زمانے میں کسی سپاہی کی جانب سے وفاداری کا مظاہرہ بڑی قیمت رکھتا ہے اور اس کا باغی فوج کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوجانا بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا جاتا ہے، اُسے خلعت شاہی اور گراں قدر انعامات سے نوازا جاتا ہے، اس کے منصب میں ترقی دی جاتی ہے اور اسے بیش بہا عطیات کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

آج جب کہ بگڑی ہوئی انسانیت میں اپنے خالق سے بغاوت و برگشتگی کی فضا عام ہے، احکامِ الٰہیہ کو توڑا جارہا ہے، مادیت کا فتنہ اطرافِ عالم کو محیط ہے، ایسے حالات میں جو لوگ اپنے کریم آقا سے وفاداری واطاعت شعاری کا ثبوت پیش کریں گے انہیں بیش بہا انعامات کی دولت سے نوازا جائے گا، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

''**العبادة في الهرج كهجرة إليَّ۔**'' (مشکوٰۃ، ص:۴۶۲، بروایت مسلم)

ترجمہ:......''فتنہ کے زمانے میں عبادت کرنے کا درجہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص ہجرت کر کے میرے پاس آجائے۔''

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ:

''اس اُمت کے آخر میں کچھ لوگ ہوں گے، جن کو اُمت کے پہلے لوگوں (صحابہ کرامؓ) جیسا اجر وانعام عطا کیا جائے گا۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم کریں گے، اس کی نافرمانی سے منع کریں گے، اور ان لوگوں سے جو فتنہ میں مبتلا ہیں، مقابلہ کریں گے۔'' (مشکوٰۃ، ص:۵۸۴)

اس پُرفتن زمانہ میں جن سعادت مندوں کو اپنے ایمان کی فکر اور اطاعتِ خداوندی کی لگن ہے، اور جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ امت کو ایمان وعمل کی لائن پر ڈالنے کی محنت میں کوشاں ہیں، وہ بہت ہی مبارک باد کے مستحق ہیں، انہیں فتنوں سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ یہ ان کے لیے نہایت اعلیٰ درجات وترقیات کا ذریعہ ہیں، مگر خود مادیت کے گرداب سے نکل کر ایمان ویقین کی لائن پر آنا، اور بندگانِ خدا کو اس کی دعوت دینا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وقفہ وقفہ کے بعد کچھ وقت نکال کر اللہ والوں کی پاکیزہ مجلسوں میں حاضری دی جائے، ہر محلّہ کی مسجد کو محلّہ والوں کی دینی ضروریات اور ایمان وعمل کی دعوت کا مرکز بنایا جائے، ہر گھر کو ذکر وتلاوت سے معمور کیا جائے اور اس کے لیے اتنی محنت کی جائے کہ ہر مسلمان کا رابطہ مسجد سے اُستوار ہوجائے، بس یہ ہے آج امت کی سب سے بڑی ضرورت۔

''چونکہ احکامِ شرعیہ کا مدار حسابِ قمری پر ہے، اس لیے اس کی حفاظت فرض الکفایۃ ہے، پس اگر ساری امت دوسری اصطلاح کو اپنا معمول بنالیوے، جس سے حسابِ قمری ضائع ہوجائے، سب گنہگار ہوں گے اور اگر وہ محفوظ رہے (تو) دوسرے حساب کا استعمال مباح ہے، لیکن خلافِ سنتِ سلف ضرور ہے اور حسابِ قمری کا برتنا بوجہ اس کے فرضِ کفایہ ہونے کے لابد افضل واحسن ہے۔'' (تفسیر بیان القرآن: حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ)

کہنے کو تو چھوٹی سی بات ہے، مگر ہے بہت بڑی، انگریزیت کے زیر اثر آج کے دیندار حلقوں میں بھی انگریزی تاریخ کا رواج ایسا عام ہے کہ اسلامی تاریخ کی سنت بہت سے حلقوں میں مٹ چکی ہے، آیئے! نئے سال کے آغاز پر اس سنت کے احیاء کا عزم کریں۔ **وفقنا الله لكل خير وسعادة، وصلى الله تعالىٰ على صفوة البرية محمد وآله وأصحابه وأتباعه أجمعين۔**

لا مذہبیت کا فتنہ لا دینیت پر جا کر ختم ہوتا ہے!

حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ

حامداً و مصلیاً و مسلماً: أما بعد:

دین کی کچھ باتیں تو ایسی سادہ اور آسان ہوتی ہیں کہ جن کے جاننے میں سب خاص و عام برابر ہیں، جیسے وہ تمام چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے یا مثلاً وہ احکام جن کی فرضیت کو سب جانتے ہیں، چنانچہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ارکانِ اسلام میں داخل ہیں، لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جو عوام کی سمجھ میں نہیں آتے، اس لیے ان کو علماء سے پوچھنا ضروری ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کو اہل علم قرآن وحدیث میں غور کرنے کے بعد سمجھتے ہیں اور علماء کو بھی ان مسائل کے سمجھنے کے لیے شرعی طور پر ایک خاص علمی استعداد کی ضرورت ہے، جس کا بیان اصولِ فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے، بغیر اس استعداد کے حاصل ہوئے کسی عالم کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی مشکل آیت کی تفسیر کرے، یا کوئی مسئلہ قرآن وحدیث سے نکالے۔ جس عالم میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنی پوری کوشش صرف کر کے قرآن وحدیث سے مسئلہ نکالتا ہے، اس کو مجتہد کہا جاتا ہے اور جس شخص میں یہ استعداد نہ ہو وہ عامی ہے، عامی کو یہ حکم ہے کہ ہر مسئلہ میں مجتہد کی طرف رجوع کرے اور مجتہد کا یہ فرض ہے کہ وہ جو مسئلہ بھی بیان کرے کتاب وسنت میں خوب غور کر کے اور اپنی پوری کوشش صرف کر کے اولاً اس مسئلہ کو سمجھے اور پھر اس پر فتویٰ دے۔

اجتہاد وفتوی کا یہ سلسلہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک اُمت میں رائج چلا آرہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی بہت سے ایسے حضرات صحابہ کرامؓ میں تھے جو آنحضرت ﷺ کی اجازت سے خود مدینہ شریف میں اور تمام ملکِ عرب میں جہاں اسلام پھیل چکا تھا' فتویٰ دیا کرتے تھے اور سب لوگ ان کے فتوی پر عمل کیا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد تابعینؒ کے دور میں بھی یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا، بلکہ ہر شہر کے مفتی اور مجتہد جو مسائل بیان کرتے تھے اس شہر کے رہنے والے انہی کے فتاویٰ کے مطابق تمام احکامِ دین پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ پھر تبع تابعین کے دور میں ائمہ مجتہدین نے کتاب وسنت اور گزشتہ مجتہدین صحابہؓ وتابعینؒ کے فتاویٰ کو سامنے رکھ کر زندگی کے ہر باب میں تفصیل

سے احکام مرتب کردیئے۔ ان ائمہ میں اولیت کا شرف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے، پھرامام مالکؒ اوران کے بعد امام شافعیؒ اورامام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین ہیں۔

چونکہ ان ائمہ اربعہ رحمہم اللہ نے زندگی میں پیش آنے والے اکثر وبیشتر مسائل کوجمع کردیا تھا اور ساتھ ہی وہ اُصول بھی بیان کردیئے تھے کہ جن کی روشنی میں یہ احکام مرتب کیے گئے تھے، اس لیے تمام اسلامی دنیا میں قاضیوں اورمفتیوں نے انہی کے مسائل کے مطابق فیصلہ کرنا اوران پرفتویٰ دینا شروع کردیا، اس طرح تمام عالم اسلامی میں ان حضرات کے مذاہب مقبول ومعتمد ہوگئے، چنانچہ یہ سلسلہ دوسری صدی سے لےکرآج تک اسی طرح قائم ودائم ہے۔

ہندوستان میں جب انگریز کی عملداری شروع ہوئی تو اس زمانہ میں کچھ لوگوں کے سر میں یہ سودا سمایا کہ ہمیں اگلوں کے فتاویٰ پر چلنے اوران کی تقلید کرنے کی کیا ضرورت ہے؟! ہمیں تو خود قرآن وحدیث سے مسئلے نکالنے چاہئیں، یہ لوگ اپنے آپ کو اہل حدیث یا غیر مقلد کہتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ بھی مقلد ہی ہیں۔ ان کے عوام تو مسجد کے مولوی ملاؤں سے مسئلے پوچھ پوچھ کران پرعمل کرتے ہیں اور یہ خود حدیث کی کچھ کتابوں کو سامنے رکھ کر علمائے شوافع نے جواُن کا مطلب بیان کیا ہے اس پر چلتے ہیں۔ حدیث کی تصحیح وتضعیف اور راویانِ حدیث کی جرح وتعدیل میں بھی یہ محدثین ہی کے مقلد ہیں، چنانچہ بطور مثال ان کے نزدیک امام بخاریؒ یا امام ترمذیؒ کا کسی حدیث کوصحیح یا ضعیف کہنا اس حدیث پرعمل کرنے یا نہ کرنے کے لیے کافی ہے، حالانکہ انہیں پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ حدیث کیوں صحیح ہے؟ یا کیوں ضعیف ہے؟ غرض اس بارے میں یہ بخاریؒ وترمذیؒ کی تقلید کوکافی سمجھتے ہیں اوراس باب میں اجتہاد نہیں کرتے۔

اس عدمِ تقلید کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان میں دین ومذہب کے اندر فتنوں کے دروازے کھل گئے، ہر شخص مجتہد بن بیٹھا، چنانچہ سب سے پہلے سرسید احمد خان نے اس راہ میں قدم رکھا، پہلے حنفی مذہب کو خیر باد کہا، تقلید سے منہ موڑا، غیر مقلد ہوئے، پھر ترقی کرتے کرتے نیچریت پر معاملہ جا پہنچا، اور ظاہر ہے کہ جب فقہاء کی تقلید حرام ٹھہری تو تصحیح وتضعیف میں کسی محدث کی کیوں سنی جائے اور بغیر دلیل سمجھے اس کو کیوں صحیح مان لیا جائے؟! یہی حال غلام احمد قادیانی کا ہوا، وہ مذہب حنفی سے نکلا اور غیر مقلدیت میں بڑھتے بڑھتے معاملہ یہاں آکر ٹھہرا کہ مہدی سے بھی آگے بڑھ کر مسیح موعود کے منصب پر اپنے کو پہنچا دیا۔ دوسری طرف اس انکارِ تقلید نے انکارِ حدیث کی راہ دکھلائی، چنانچہ اسلم جیراج پوری کے دادا حنفی تھے، ان کے باپ مولوی سلامت اللہ غیر مقلد بنے، اسلم جیراج پوری نے باپ دادا سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا تو انکارِ حدیث کے داعی بن گئے اوران کے نام لیوا مسٹر پرویز کی زندگی کا مشغلہ ہی حدیث وسنت کا مذاق اُڑانا رہ گیا۔ اسی طرح ملک میں جتنے دوسرے دینی فتنے ہیں، وہ سب انکارِ تقلید کے شاخسانے ہیں۔ پہلے آدمی تقلید سے منکر ہوتا ہے، غیر مقلد بنتا ہے اور پھر اس کی خودرائی اسے گمراہی کے گڑھے میں ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب سے مذاہب اربعہ کا رواج ہوا، مسلمانوں میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے بند ہوگئے تھے اور جب سے تقلید کا بند ٹوٹا ہے اور لامذہبی کا دور دورہ ہوا ہے، ہر طرف نئے نئے فتنے سر اُٹھانے لگے ہیں۔ آج کل خود کراچی شہر میں ہی دو نئے فتنے زور سے سر اُٹھا رہے ہیں: ایک فتنہ کراچی کے ساحل سے توحید کے نام پر اُٹھ رہا ہے، چنانچہ وہاں سے کتابچے ’’توحید خالص‘‘ کے نام سے شائع ہورہے ہیں، ان میں یہی بتایا جارہا ہے کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر آج تک کوئی توحید کا حامل ہی نہیں رہا اور خاص کر ہندوستان کو تو تصوف نے ایسا تباہ کیا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تک ایک بھی مسلمان کہلانے کے لائق نہیں، اس فتنہ کا سربراہ ایک نامسعود شخص تھا جو حال میں فوت ہوگیا۔

دوسرا فتنہ کراچی شہر کی دوسری سمت سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نام سے برپا کیا گیا ہے، جس کا مقصد ناصبیت کو زندہ کرنا ہے۔ اس فتنے کا سربراہ یزید اور مروان کا فدائی ہے اور ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور ائمہ اہل بیتؒ کو کوسا جائے اور ان کی عظمت کو پامال کیا جائے۔ اس فتنہ کا سربراہ نامحمود عباسی تھا، وہ تو مرگیا، اب اس کے چیلے چانٹے اس فتنہ کو ہوا دے رہے ہیں۔ ان دونوں فتنوں کی خرابی اور نقصان کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے یہاں سے اس سلسلہ میں جو کتابچے شائع کیے جاتے ہیں ان کو دیکھ لیا جائے کہ کس قدر گمراہی پھیلا رہے ہیں۔

..... ✿ ..... ✿ ..... ✿ .....

علاج معالجہ

ملکی وغیر ملکی مریضوں کا ستر سالہ معالج، فاضل الطب والجراحت، رجسٹرڈ درجہ اول، سابقہ لیکچرار طبیہ کالج، ڈبل ایوارڈ یافتہ گولڈ میڈلسٹ سے امراضِ مردانہ، زنانہ، بچگانہ کے علاج بالتدبیر، بالغذا و بالدوا کے لیے رابطہ کریں۔

www.hakeemkarimbhatti.com

0321-7545119 0345-7545119

مکاتیب علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ وترتیب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

...بنام ...مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

(ساتویں قسط)

﴿ مکتوب:......۱۳ ﴾

جناب مولانا، جلیل القدر استاذ، سید محمد یوسف بنوری حفظہ اللہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے والا نامے سے مسرت وشادمانی ہوئی، لیکن ہونہار فرزند کی وفات (کی خبر) نے مجھے غمزدہ کردیا، اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِعظیم عطا فرمائے، وہی دے کر لے لینے والا اور پھر بدل عطا کرنے والا ہے۔ نیز عزیز بھائی مولانا (احمد رضا) بجنوری کو ان کی رفیقہ محترمہ اور چھوٹی بیٹی کی وفات سے پہنچنے والے صدمے نے بھی غمگین کردیا، اللہ ہی (ان کے اس غم کی) تلافی کرنے والا اور عوض دینے والا ہے، ہم بھلا کرہی کیا سکتے ہیں؟! اس دنیا کی یہی حقیقت ہے!

آپ کی لذت افروز علمی باتوں سے میں بہت لطف اندوز ہوتا ہوں، ان کو سن کر میرے شوق کی آگ سلگنے لگتی ہے۔ (مولانا) مبارک پوریؒ کے متعلق (پچھلے خط میں ذکر کردہ) میرا کلام اس خیال کی بنا پر نہ تھا کہ کہیں آنجناب ان کے معاملے کو نظر انداز نہ کردیں، بلکہ محض دلی اطمینان کے لیے کہہ گزرا، میں مطمئن ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بارآور فرمائے اور ہر خیر کی توفیق ارزاں فرمائے۔ بوجہ علالت مولانا عثمانی کے علمی سرگرمی سے انقطاع پر افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں شفا وعافیت عطا فرمائے۔ اشاعتِ علم کے لیے دہلی جیسے شہر کو مرکز بنانا بہت مناسب ہے۔ ہمارا رب آپ کو توفیق دے اور ثابت قدم رکھے۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق میرا چھوٹا سا رسالہ ان شاء اللہ! شطحیات پر مشتمل مقالات کے رَد

کے حوالے سے کمر توڑ ہے، میں نے اس کا عنوان ''نظرة عابرة'' رکھا ہے، اس لیے کہ یہ موضوع گہری نگاہ سے بے نیاز ہے۔ ان شاء اللہ! ترسیلِ کتب کی اجازت ملتے ہی ارسال کروں گا۔

اس موضوع پر مولانا کشمیری کے رسائل (۱) بھیجنے کی مکرر اُمید رکھتا ہوں، افسوس کہ بعض بھائیوں نے ان میں سے کچھ (رسائل) ضائع کر دیئے ہیں، اور آپ نے درست فرمایا کہ یہ عقیدہ 'مجمع علیہ ومتواتر ہے۔ والسلام علیکم، ہمیشہ بخیر رہو میرے انتہائی عزیز بھائی!

مخلص

محمد زاہد کوثری

رمضان سنہ ۱۳۶۴ھ، شارع عباسیہ نمبر: ۶۳

پس نوشت:......''النظرة'' کے (ص:۱۰) میں لکھا ہے: ''نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی احادیث کے متواتر ہونے کی صراحت ابن جریر (۲)، آبری (۳)، ابن عطیہ (۴)، ابن رشد کبیر (۵)، قرطبی، ابوحیان، ابن کثیر (۶) ابن حجر وغیرہ حفاظِ (حدیث) نے کی ہے، اور یہ سب اہلِ فن ہیں، مزید براں شوکانی (۷)، صدیق (حسن) خان (۸) اور کشمیری نے بھی اپنی تالیفات میں ان (روایات) کے متواتر ہونے کی تصریح کی ہے۔ رہی بات اجماع کی تو اس کی صراحت حافظ عبدالحق بن عطیہ اندلسی اور حافظ ابوحیان نے اپنی تفسیروں میں کی ہے۔ ''البحر'' (۴۷۳/۲) میں ہے: ''ابن عطیہ کہتے ہیں: حدیثِ متواتر سے ثابت شدہ اس عقیدے پر اُمت کا اجماع ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) آسمان میں زندہ ہیں اور آخری زمانے میں نزول فرمائیں گے۔''

''النهر'' (۴۷۳/۲) کے حاشیے میں ہے: ''امت کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان میں زندہ ہیں اور عنقریب نزول فرمائیں گے۔'' لیکن ابن حزم ''مراتب الإجماع'' (۹) اور ''المحلی'' (۱۰) میں اس اجماع کا اقرار نہیں کرتے۔''

اس مسئلے کے کتاب وسنت اور اجماع کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے ہمارے رسالے میں توسع ہے۔ ''القول الفصل'' (۱۱) میں شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے بھی اس مسئلے پر عمدہ کلام کیا ہے، اور ہمارے دوست (۱۲) عبداللہ بن صدیق (غماری) (۱۳) کا بھی ''إقامة البرهان علی نزول عیسیٰ علیه السلام فی آخر الزمان'' کے نام سے رسالہ ہے۔ بذریعہ ڈاک کتابوں کی ترسیل کی چھوٹ ملنے پر ان شاء اللہ! جلد ہی یہ سب رسائل بھیجوں گا۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے منکر کو کافر قرار دینا' سیوطیؒ کے رسالہ ''الإعلام'' (۱۴) میں مذکور ہے، میں کہتا ہوں کہ آلوسی کی ''روح المعانی'' (۱۵) میں بھی درج ہے۔ نیز انہوں نے، کلاباذی نے ''معانی الأخبار'' (۱۶) میں اور سفارینی نے اپنی ''شرح العقیدة'' (۱۷) میں نزولِ عیسیٰ علیہ السلام پر اجماع نقل کیا ہے۔

حافظ (ابن حجرؒ) نے ’’التلخیص‘‘(۱۸) میں (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے) زندہ حالت میں آسمان کی جانب رفعِ جسمانی پر محدثین ومفسرین کا اتفاق ذکر کیا ہے۔

حواشی

۱:......اس موضوع پر علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل رسائل ہیں: ’’عقیدة الإسلام فی حیاة عیسیٰ علیه السلام‘‘ یا ’’حیاة المسیح بمتن القرآن وشرح الحدیث الصحیح‘‘، ’’تحیة الإسلام بحیاة عیسیٰ علیه السلام‘‘ اور ’’التصریح بماتواتر فی نزول المسیح‘‘۔

۲:......’’جامع البیان عن تأویل آی القرآن‘‘ (ج:۶، ص:۴۵۸)۔

۳:......جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے ’’فتح الباری‘‘ (ج:۶، ص:۴۹۳-۴۹۴) میں ان سے نقل کیا ہے۔

۴:......’’المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز‘‘ (ص:۳۰۸)۔

۵:......’’شرح الأبی علی صحیح مسلم‘‘ (ج:۱، ص:۲۶۵)۔

۶:......’’تفسیر القرآن العظیم‘‘، تفسیر سورة الزخرف (ص:۱۶۸۴)۔

۷:......ان کی کتاب کا نام ’’التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر والمهدی والمسیح‘‘ ہے۔

۸:......’’الإذاعة لما کان ویکون بین یدی الساعة‘‘ (ص:۷۷)۔

۹:......(ص:۱۷۳) پر لکھتے ہیں: ’’اس میں اختلاف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے قبل آئیں گے یا نہیں۔‘‘

۱۰:......’’المحلی بالآثار شرح المجلی بالاختصار‘‘ (ج:۱، ص:۴۳)۔

۱۱:......’’القول الفصل بین الذین یؤمنون بالغیب والذین لایؤمنون‘‘، یہ ان کی کتاب ’’موقف العقل والعلم والعالم‘‘ کا تیسرا جزء ہے، جو پہلے الگ چھپا اور پھر اصل کتاب کے ضمن میں طبع ہوا ہے۔

۱۲:......علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا ہے کہ شیخ عبداللہ غماری ان کے دوست تھے، حالانکہ شیخ ان کے شاگردوں کے درجے میں ہیں، علامہ موصوف نے ان کی مذکورہ کتاب ’’إقامة البرهان‘‘ کا مقدمہ بھی لکھا ہے، اور اس مقدمے سے قبل شیخ غماری یوں رقم طراز ہیں: ’’بعض حاسدین کی ناکام کوششوں کے باوجود میرے اور استاذ کوثری کے درمیان مضبوط تعلق رہا، وہ مجھے بہت عزت دیتے تھے، حتیٰ کہ ان کی وفات سے ایک برس قبل میں نے ان سے اجازتِ حدیث طلب کی تو انہوں نے بھی مجھ سے اجازت کا مطالبہ کر دیا، بعض لوگ ان سے احادیث کے متعلق پوچھتے تو وہ مجھ سے دریافت کرتے تھے۔ ان کی وفات تک یونہی تعلق برقرار رہا، اللہ ان پر رحم فرمائے اور انہیں اپنی رضا کا پروانہ عطا فرمائے۔‘‘ دونوں اہل علم کا باہمی احترام ملاحظہ کیجیے۔

۱۳:...... علامہ عبداللہ بن محمد بن صدیق غماری: فقیہ ومحدث، اُصولی ومتکلم اور بہت سے فنون کے ماہر، ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۱۳ھ میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے، مزید دیکھیے: ان کی خود نوشت ’’سبیل التوفیق فی ترجمة عبدالله بن الصدیق‘‘۔

۱۴:......’’الإعلام بحکم عیسیٰ علیه السلام‘‘ فی ضمن ’’الحاوی للفتاوی‘‘ (ج:۲، ص:۱۶۶)۔

۱۵:......’’روح المعانی‘‘ (ج:۲۲، ص:۳۴)۔

۱۶:......’’بحر الفوائد المشهور بمعانی الأخبار‘‘ (ج:۲، ص:۱۳۷)۔

۱۷:...... یہ کتاب ’’لوامع الأنوار البهیة وسواطع الأسرار البهیة فی شرح الدرة المضیة فی عقد الفرقة المرضیة‘‘ (ج:۲، ص:۹۴)۔

۱۸:......’’التلخیص الحبیر فی تخریج أحادیث الرافعی الکبیر‘‘ (ج:۴، ص:۴۳۱)۔

(جاری ہے)

انشورنس کی اسلام کاری! نیا اور پرانا طرز

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علٰی سید المرسلین وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین، أما بعد!

انشورنس، درحقیقت کاروبار کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں بیمہ پالیسی خریدنے والے شخص کو مستقبل کے خطرات کے تحفظ اور غیر متوقع نقصانات کی تلافی کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اس کاروبار کے تاریخی تسلسل کے ابتدائی سرے بعض مؤرخین نے ۶۰۰ قبل مسیح سے بھی بتائے ہیں، مگر زیادہ مشہور یہی ہے کہ تجارتی سامان کی بحری ترسیل کے دوران سامان کی حفاظت اور نقصانات کی تلافی کے لیے باقاعدہ پہلا معاہدہ تقریباً ۱۳۴۷ء میں کیا گیا اور اس نوعیت کے معاہدات اُنیسویں صدی میں مستقل و مستحکم انداز سے انجام پانے لگے اور پوری دنیا میں تقریباً عام ہوگئے اور بین الاقوامی تجارت کے لیے ناگزیر سمجھے جانے لگے۔ اس شیوع اور عموم کے نتیجے میں مسلمان تاجر تجارتی نفع اندوزی کے طمع ولالچ میں یا مجبوری کی بنا پر انشورنس کی طرف متوجہ ہوئے تو مسلمان تجار کے ذریعہ مسلمان فقہاء کے سامنے انشورنس کی رائج الوقت شکل پیش ہوئی اور فقہاء کرام نے اس کے حکم کی تفصیلات بتائیں۔ ہمارے فقہاء میں سے علامہ ابن عابدین محمد امین الشامیؒ (متوفی: ۱۲۵۲ھ) تقریباً پہلے محقق ہیں جو انشورنس کی روایتی شکل اور اس کے فقہی حکم کو اپنے حاشیہ ''رد المحتار علی الدر المختار'' میں ''باب المستأمن'' کے تحت ''سوکرہ'' کے عنوان سے زیر بحث لائے ہیں اور آخر میں ارشاد فرمایا کہ:

''والذی یظھر لی أنہٗ لایحل للتاجر أخذ بدل الھالک من مالہٖ لأن ھذا التزام مالایلزم۔'' (ج:۴،ص:۱۷۰، ط: بیروت)

انشورنس کی بابت خاتمۃ المحققین علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پہلا فتویٰ حنفی فقہاء کے ہاں پہلا اور آخری تحقیقی موقف تھا، اسی بنا پر انشورنس کے بارے میں فقہاء احناف، تقریباً ہر زمانے میں عدمِ جواز کے قائل رہے ہیں اور انشورنس کو ناجائز ہی بتاتے چلے آرہے ہیں۔ فقہاء احناف کو انشورنس کے حرام ہونے میں کبھی تردد یا تأمل نہیں ہوا۔

مگر بعض عرب علماء کرام ایسے بھی گزرے ہیں کہ جنہوں نے انشورنس کے عالمی پھیلاؤ،

تجارت کے لازمی جزء اور خطرات وضمانات کی تلافی کی معقولیت کی بنیاد پر انشورنس کو خلافِ اسلام کہنے کی بجائے اسلامی افکار ومزاج سے ہم آہنگ قرار دیا اور اس موقف کے لیے انہوں نے اپنا علمی وقلمی زور بھرپور انداز سے استعمال فرمایا، ایسے عرب علماء میں مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی، استاذ حلاّف اور استاذ مصطفیٰ الزرقاء بطورِ خاص یاد کیے جاتے ہیں۔ استاذ مصطفیٰ الزرقاء نے ''**عقد التأمين وموقف الشريعة**'' کے عنوان سے باقاعدہ تحریر لکھی جس میں انشورنس کی اہمیت وضرورت اور فقہ اسلامی میں اس کے جوازی دلائل بڑی قوت سے پیش فرمائے۔ استاذ ابوزہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ استاذ زرقاء کا جواب دینے کی بھرپور کوشش فرمائی اور ان کے فلسفیانہ مفروضوں اور فقہی دلائل کا بھرپور انداز سے جواب دیا، لیکن مصطفیٰ الزرقاء اور ان کے ہم نوا دیگر اہل علم کی یہ تحریری کاوش اسلامی مفکرین کے بیچ اپنے اچھے خاصے اثرات چھوڑ گئی۔

من جملہ یہ کہا جانے لگا کہ انیسویں صدی کا مغربی صنعتی انقلاب چونکہ دنیا پر حاوی ہو چکا ہے، اس لیے مغرب اور اسلام کے درمیان تقریب کا راستہ یہی ہے کہ مغربی تجارتی شکلوں کو ان کے لوازمات کے ساتھ اسلام سے ہم آہنگ کیا جائے اور اس کے لیے فقہ اسلامی سے ایسی تخریجات کی جائیں جو مغربی فکر وفلسفہ کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی سرمایہ کاری کی شکلوں کو اسلامی کہہ کر اپنانے میں معاون ثابت ہوں، ورنہ دنیا کی صنعتی ترقی میں مسلمان شریکِ سفر نہیں ہو سکتے، لہٰذا اس عالمی اقتصادی ضرورت کے تحت لامحالہ مسلمانوں کو مغرب سے آئی ہوئی تجارتی شکلوں اور ان کے لوازم کی اسلام کاری کرنی پڑے گی۔ اسی نظریئے کے تحت شیخ زرقاء کے معاصر استاذ حلاف وغیرہ نے تو یہ موقف اپنایا کہ بیمہ مطلقاً جائز ہے اور کئی عرب وغیر عرب علماء ان کی رائے کے ہم نوا بھی بنتے چلے گئے اور بیمہ کے مطلق جواز کا ایک نظریہ بھی قائم ہوگیا، چنانچہ بایں طور انشورنس کی اسلام کاری کا رواج چل پڑا۔ البتہ عام مجوزین نے وہی طریقہ اپنایا جو استاذ زرقاء نے متعارف کرایا تھا۔ ان کی پیروی اور نقالی میں پاک وہند کے بعض نامی گرامی لوگ بھی اس فکری تجدد کا شکار ہو کر مغرب کے مقلد بن بیٹھے اور انہوں نے استاذ زرقاء والے عربی مضامین کو اردو زبان میں ڈھالا اور اپنی تحقیقات کر کے اسلامیانِ ہند کے سامنے انشورنس کی اسلام کاری کا فریضۂ نامرضیہ انجام دیا۔

لیکن اس وقت کے اکابر نے انشورنس کی اس اسلام کاری کے رَد میں بھرپور کردار ادا فرمایا۔ حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی اعظم مفتی ولی حسن ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کا مجموعہ ''بیمۂ زندگی'' کے نام سے مطبوع ومتداول ہے، جس کا بنیادی ہدف یہی تھا کہ انشورنس کو اپنی جمیع خصوصیات کے ساتھ لازمی قرار دینے والی فکر اور اُسے ہر حال میں فقہی تخریج سے آراستہ کر کے عوام الناس کے لیے علمی سند بنانا شرعاً غلط ہے۔ مغربی تجارتی شکلوں کی اسلام کاری کا یہ انداز ہمارے فقہاء کا نہیں بلکہ

بعض مصری وشامی علماء کا انفرادی شذوذ ہے، جو اصولاً لائق تقلید نہیں ہے۔ مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ان علماء کا کردار بھی قابل مذمت ہے جو یورپ کے ماہر اقتصادی نظام کی چند خوبیاں اور خوشنما پہلوؤں کو دیکھ کر جواز اور حلت کا فتویٰ دینے میں جری ہیں۔''

(جواہر الفقہ، ج:۴،ص:۴۹۱، ط: مکتبہ دار العلوم کراچی)

حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بعض تجدد پسند علماء عصر نے اس (انشورنس) کو امدادِ باہمی کا معاہدہ قرار دے کر موالیٰ الموالات کے احکام پر قیاس فرمایا ہے، وہ قیاس مع الفارق ہے ....
درحقیقت مروجہ بیمہ کو امدادِ باہمی کہنا اِک دھوکہ ہے اور بیمہ اور سٹہ سے سودی کاروبار پر آنے والی نحوست کو پوری قوم کے سر ڈالنے کا ایک خوبصورت حیلہ ہے۔''

(جواہر الفقہ، ج:۴،ص:۱۷۴، ط: مکتبہ دار العلوم کراچی)

الحمدللہ! انشورنس کی اسلام کاری کے اس طرزِ عمل کی روک تھام کرنے میں ہمارے اکابر اس حد تک سرخرو ہوکر نکلے کہ انشورنس کو اپنے اغراض واہداف اور خصائص ولوازم کے ساتھ اسلامیانے کے لیے علماء کے طبقہ میں سے کسی نے پھر ہمت نہیں کی اور انشورنس کو اپنے نام اور کام کے ساتھ کسی نے جائز ہونے کا فتویٰ نہیں دیا۔ جنہوں نے انشورنس کو اس کے نام وکام کے ساتھ جائز بتانے کی کوشش کی، وہ خیانت ودروغ گوئی کی نت نئی بے ساکھیوں کا سہارا لیتے رہے، مگر منزل یاب نہ ہوسکے۔

لیکن انشورنس کے بھوت سے جس طرح دنیا واگزار نہیں ہوسکی، اسی طرح انشورنس کی اسلام کاری کے جذبات، اس کی فکر اور اس کے لیے زرقائی طرز کی عملی کوشش کسی نہ کسی حد تک زندہ رہی، بلکہ جسدِ اسلامی کے لیے اس اندرونی پھوڑے کی مانند زندہ رہی جو ایک مقام پر مداوا کے بعد دوسرے مقام سے نیا منہ لے کر نمودار ہوجاتا ہو۔

چنانچہ انشورنس کی اسلام کاری کی زرقائی انداز کی 'کوشش' تقریباً ۱۹۷۰ء- ۱۹۷۹ء میں سوڈان اور بحرین میں پہلی ''تکافل کمپنی'' کے نام سے صفحۂ عالم اسلام پر دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس تکافل کمپنی کا بنیادی ہدف بھی یہی تھا کہ انشورنس کے عالمی جال میں پھنسی ہوئی اُمتِ مسلمہ انشورنس کے اہداف ومقاصد کیسے حاصل کرے، مسلمان اپنے تجارتی اسفار اور سامان میں راستے کے خطرات اور مستقبل کے نقصانات سے کس طرح نمٹیں؟ یہ اہداف فکری اعتبار سے انشورنس سے ممتاز تو نہیں بلکہ یکساں تھے، البتہ اسمی اعتبار سے دونوں میں امتیاز صاف ظاہر ہے ایک انشورنس ہے اور دوسرا ''تکافل'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس لیے مسلمان تاجر اول وہلہ میں یہاں انشورنس کے مقاصد کے لیے انشورنس کے نام پر چونکنے سے بچ گیا اور اس کی سماعتیں انشورنس کے کریہہ لفظ کو سننے سے

محفوظ رہیں، مزید یہ کہ ’’تکافل‘‘ خود چونکہ عربی کا لفظ ہے، عربی زبان والے جانتے ہیں کہ تکافل آپس میں ذمہ داریوں کے تبادلے اور تناوُب (باریاں لینے) کا نام ہے اور غیرعربی مسلمانوں کے لیے ’’تکافل‘‘ کے اسلامی ہونے کے لیے ’’تکافل‘‘ کا عربی لفظ ہونا ہی پہلی دلیل ہے، اب عربوں کے علاوہ عجمیوں بالخصوص برصغیر میں اور ہمارے ہاں تکافلی کمپنیوں کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ زیر بحث آیا اور سوڈان وبحرین اور ملائیشیا وغیرہ میں تکافل کے نام سے انشورنس کی اسلامائزیشن کا جو نیا دور چلا تھا، اس کا جائزہ لینے کے لیے اہل علم متوجہ ومتفکر ہوئے، چنانچہ ۲۰۰۲ء میں مرکز الاقتصاد الاسلامی کراچی نامی ایک ادارے کے لیٹر ہیڈ پر ’’**شرکات التکافل** پر چند ملاحظات‘‘ کے عنوان سے چند ورقی ایک تحریر سامنے آئی، جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ فی زمانہ مشرقِ وسطیٰ اور ملائیشیا وغیرہ کے بعض علماء نے ’’**شرکات التکافل** ‘‘ کے نام سے فقہی بنیادوں پر انشورنس کے مقاصد کو اسلامی اصولوں کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان علماء نے تبرع اور ہبہ بشرط العوض کی بنیاد پر انشورنس کی اسلام کاری کی کوشش کی ہے اور اپنے موقف کی صحت پر دلائل بھی قائم کیے ہیں، مگر ان علماء عرب کی تحقیقات اور استدلالات پر ہمارے ایک موقر بزرگ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زیدمجدہم کو کچھ ملاحظات اور تحفظات ہیں اور یہ تحریر درحقیقت حضرت عثمانی زیدمجدہم کے تحفظات وملاحظات کو اہل علم کے سامنے پیش کرنے کے لیے حضرت ہی کے نام سے لکھی گئی تھی، اور اس تحریر میں اہل علم سے استدعا کی گئی تھی کہ آپ حضرات ان ملاحظات کو بھی دیکھیں اور اس نظام سے متعلق اپنی علمی آراء کو مرتب بھی فرمائیں، تاکہ اگلے مرحلے میں ان پر بحث وتمحیص ہو سکے اور کوئی مفید علمی نتیجہ برآمد ہو سکے۔

’’**شرکات التکافل** ‘‘ سے متعلق حضرت مفتی محمد تقی عثمانی زیدمجدہم کے ملاحظات پر مشتمل مذکورہ تحریر ہمارے شیخ حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی بھیجی گئی تھی اور حضرت نے اس پر مقالہ بھی پیش فرمایا تھا، اس مقالے میں دو باتیں بنیادی تھیں:

۱:...... یہ کہ مرجہ تکافلی کمپنیوں سے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم نے جو ملاحظات واشکالات اٹھائے ہیں وہ واقعۃً درست ہیں، گویا کہ اس وقت تک تکافلی کمپنیوں کی جو فقہی بنیادیں سامنے آئی تھیں وہ روایتی انشورنس کی ایسی تخریج ہے جسے فقہی تکییف وتطبیق نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا ۱۹۷۹ء سے جو تکافلی نظام متعارف ہوکر آ رہا تھا وہ قابلِ اشکال ہے، بلکہ ۲۰۰۲ء کی مجلس نے واضح طور پر کہا کہ ’’مروجہ تکافل کمپنیوں کی بنیاد پالیسی ہولڈرز کی طرف سے تبرع پر رکھی گئی ہے اور یہ کہا گیا تھا کہ مجلس محسوس کرتی ہے کہ وقف کے بغیر ’’تبرع‘‘ کی بنیاد پر تکافل کمپنیوں کے قیام میں متعدد اشکالات ہیں۔‘‘

(تکافل کی شرعی حیثیت، ص:۱۳۶)

اس بنا پر یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے کہ مجوزہ مجلس کے زمانۂ انعقاد تک مجوزہ تکافل کے بارے

میں اہل علم کے اشکالات رفع نہیں ہوسکے، نیز مولانا عثمانی زیدمجدہم نے جو اشکالات اُٹھائے تھے اور دیگر اہل علم نے ان اشکالات سے اتفاق بھی کیا تھا، تو پھر بحرین سے آیا ہوا ''تکافلی نظام'' تحفظات سے محفوظ شمار نہیں ہوسکے گا، یہ بدیہی امر ہے۔ آگے اس مجلس کی طرف منسوب کرکے یہ کہنا کہ وقف پر مبنی تکافلی نظام اشکالات سے محفوظ قرار دیا جاسکتا ہے، اگر وقف پر مبنی تکافلی نظام کے بارے میں ۲۰۰۲ء سے تاحال کوئی وقیع فقہی اشکال سامنے نہیں آیا تو پھر مروجہ تکافلی نظام کو انشورنس کی اسلام کاری کے سابقہ طریقوں سے ممتاز قرار دینا چاہیے اور اگر سابقہ طریقوں کی طرح اب بھی اشکالات سامنے آتے ہیں یا پہلے سے زیادہ اشکالات سامنے آتے ہیں تو پھر مروجہ تکافلی نظام کو انشورنس کی اسلام کاری کے پرانے طریقوں سے زیادہ ابتر، بدتر اور افحش کہنے میں حرج محسوس نہیں ہونا چاہیے۔

۲:......دوسری خاص بات اس تحریر کی یہ تھی کہ اسلام کی رو سے تکافل اپنے اصلی معنی کے لحاظ سے باہمی ذمہ داریاں بانٹ لینے کا نام ہے اور ضرر لاحق ہونے کی صورت میں ہاتھ بٹانا بھی عین اسلامی طرز و طریق ہے، اس مقصد کے حصول کے لیے ''بیمۂ زندگی'' میں بیمہ کا جو متبادل حل حضرت مفتی ولی حسن رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے، ہم اس قسم کے متبادل کے قائل ہیں، جس کا حاصل یہ بنتا ہے کہ تکافل کا مقصد انجمن امدادِ باہمی کے ذریعہ پورا کیا جاسکتا ہے، جسے بعد کے ادوار میں مختلف رفاہی ٹرسٹوں کی صورت میں عملاً اختیار بھی کیا جاچکا ہے اور اس وقت جتنے رفاہی ادارے اور ٹرسٹ کام کررہے ہیں، مختلف حادثات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، وہ سب تقریباً باہم امداد اور تعاون کی بنیاد پر خدمات انجام دے رہے ہیں اور یہ ادارے چونکہ شخصی نفع اندوزی یا ملکیتی نہیں ہوتے بلکہ حقیقی تجارت پر مبنی نفع اندوزی کے ذریعہ بلاامتیاز امداد وتعاون کے نظریے پر قائم ہوتے ہیں، اس لیے یہ ادارے وقف بھی کہلاتے ہیں۔

بہرکیف اکابر کے اس فتویٰ یا تحقیق سے اگر تکافل اور امدادِ باہمی کی انجمنوں کی نظریاتی بنیاد کے لیے استدلال کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ ۲۰۰۲ء میں کراچی کے ایک معروف ادارے میں ''تکافل'' کے حوالے سے جو مجلس مشاورت ہوئی تھی، اس مجلس میں بھی تکافل کے جواز کے لیے ''وقف'' کا لفظ بکثرت دُہرایا گیا تھا اور وقف کی بنیاد پر تکافل کے قیام کو خواہش کے درجے میں کہیں کہیں اکابر کی طرف منسوب کرنے کی بازگشت بھی ہلکے پھلکے انداز میں سنائی دی جارہی تھی، مگر وقف کی بنیاد پر مروجہ ''تکافل'' اور اس تکافل کے قیام کو اکابر کی خواہش وکوشش سے بلاقید منسوب کرنا اس وقت سے تاحال ہمیں سمجھ نہیں آسکا، بلکہ دونوں باتوں میں ایہام اور تمویہ کی ایک منفرد مہک محسوس ہورہی تھی، جو مجوزین حضرات کی ہی نئی تحریر سے مزید بھینی ہوتی جارہی ہے۔ اکابر کے بتائے ہوئے متبادل نظام پر کسی مستقل تحریر میں گفتگو کریں گے، اور کوشش کریں گے کہ اکابر کے کہے اور ہمارے بتائے ہوئے میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ ان شاء اللہ!

تاہم وقف کی بنیاد پر تکافل میں ابہام کا پہلو تو خوب واضح ہے کہ وقف اِک شرعی وفقہی اصطلاح ہے، وقف کسی شخصی ملکیتی تصور کے بجائے غیرمرئی حقیقی طاقت کی ملکیت ہوتا ہے اور وقف خاص بھی ہوتا ہے اور عام بھی ہوتا ہے۔ نیز وقف تام ہونے کے بعد استفادہ کی نوبت آنے پر ہر موقوف علیہ (جن کے نام پر وقف کیا گیا ہے) استفادہ کرسکتا ہے اور اگر واقف موقوف علیہم کے قبیل سے ہوتو وہ بھی اپنے قبیل کے دیگر موقوف علیہم کی طرح مستفید ہوسکتا ہے۔ وقف سے متعلق یہ بنیادی تفصیل فقہ کی ہر کتاب میں درج ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ جب یہ حقیقت ہر فقہی طالب علم کے لیے نا قابل انکار ہے تو اس حقیقت پر مبنی ''تکافل'' بھی نا قابل انکار ہونا چاہیے۔

مگر یہاں وقف پر تکافل کی بناء کا اِک تنقیحی پہلو بھی ہے، جس سے سہواً یا عمداً تعرض نہیں کیا گیا، بلکہ اس پہلو کی طرف جانے سے پہلو تہی کی جاتی ہے جس سے بظاہر یہی لگتا ہے کہ وقف کی شرعی اصطلاح کو مجوزہ تکافل کے جواز کے لیے ڈھال بنایا جارہا ہے۔ محض ''وقف'' کے لفظ اور اس کی ذیلی جزئیات کے نام پر مروجہ تکافل کے شرعی ہونے کا شک ووہم پیدا کیا جارہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وقف کی بیان کردہ جزئیات اور تکافل ماڈل کی مبینہ صورت؛ جب اپنے طالب علم اور عام آدمی کے سامنے بیان کی جاتی ہے تو وہ تقلیداً، عقیدتاً اور احتراماً مجوزہ تکافل پالیسی کا حصہ بننے کے لیے آمادہ ہی نہیں، بلکہ سرگرمِ عمل بھی ہوجاتا ہے، مجوزین حضرات کو اس طبقے کے سامنے وقف پر مبنی تکافل کے تنقیحی پہلو سے تعرض کی حاجت تو پیش نہیں آتی، مگر یہ بات جب اربابِ فقہ وفتویٰ اور اصحابِ علم کے سامنے آتی ہے تو وہ وقف پر مبنی مجوزہ تکافل کے تنقیحی پہلوؤں کا سوال ضرور اُٹھاتے ہیں، چنانچہ ۲۰۰۲ء میں جب ''مرکز الاقتصاد الاسلامی'' کی دعوت پر جو فقہی مشاورتی مجلس منعقد ہوئی تھی، اس میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے مشہور اہل فتویٰ کے علاوہ شیخ عبد الستار ابوغدہ حفظہ اللہ بھی شریک مجلس تھے۔ اس مجلس میں ہمارے ہاں سے حضرت اقدس مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزی شہید رحمۃ اللہ علیہ شریک تھے، جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی سے مولانا مفتی عبدالباری شریک تھے، جبکہ کراچی سے باہر کے حضرات میں سے حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب رحمۃ اللہ علیہ رئیس دارالافتاء جامعہ خیرالمدارس ملتان بطور خاص شریک تھے۔ اس مجلس میں اہل علم نے یہ سوال اُٹھایا تھا کہ مجوزہ تکافل کے لیے بنیادی طور پر جو ''وقف فنڈ'' قائم ہوگا، وہ کیسے قائم ہوگا؟ اس کے واقف کون ہوں گے؟ متولی کون ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ، اس کا جواب یہ تھا جو اَب تحریروں میں بھی آچکا ہے کہ ابتدائی طور پر چند حضرات مل کر شراکت داری کے اصولوں کے تحت قانونی طور پر ایک تکافل کمپنی بنائیں گے، جس کی حیثیت ''شخص معنوی'' کی ہوگی، پھر وقف کے ارکان: واقف، موقوف علیہ اور متولی وغیرہ کے قواعد مرتب ہوں گے، پھر صاحبانِ حصص (بانیانِ کمپنی) ایک مخصوص رقم کے ذریعہ وقف فنڈ قائم کریں گے، پھر بقیہ لوگوں کو کچھ شرائط کے ساتھ اس فنڈ میں چندہ دینے کی دعوت دی جائے گی، اس وقف فنڈ کو چندہ دینے

والے اس وقف کے موقوف علیہ بن جائیں گے، یہاں اگلے کئی جواب طلب سوالات بھی ہیں، مثلاً: اس وقف فنڈ کا مالک ومتصرف غیر مرئی طاقت ہوگی؟ جی ہاں! کیا عام شرعی وقف کی طرح وہ خالق کائنات ہے؟ کہنے کی حد تک کہہ سکتے ہیں، مگر حقیقۃً وعملاً ایسا نہیں، بلکہ اس فنڈ کی ملکیت وتصرف کی نسبت غیر مرئی معنوی شخص کی طرف ہوگی! یعنی وقف فنڈ پر حقِ تولیت تکافل کمپنی کو ملتا ہے، وہی اس فنڈ کے انتظام وانصرام کی مالک ومتصرف ہوتی ہے، اور وقف فنڈ کو ملنے والے چندے وقف فنڈ کی ملکیت کہلائیں گے۔

خیر! یہ غیر مرئی معنوی شخص، قانونی شخص' یہ کیا چیز ہے؟ یہ بات اس مجلس میں مخصوص افراد کے علاوہ دیگر اہل علم کی سمجھ میں نہ آسکی، جس پر سب سے زیادہ حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب ملتانی رحمہ اللہ نے جب زور دیا تو اس پرانے طرز کے فقیہ کو جدید دور کے جہاں گشت مفتیان کرام نے یوں سمجھایا کہ جب ایک وقف فنڈ قائم ہوگیا تو وہ ایک حوض (Pool) بن گیا، وہ حوض جس میں مزید چندہ کی رقم جمع ہوگی، وہی اس رقم کا مالک ومتصرف، لین دین کرنے والا بن جائے گا اور وقف فنڈ قائم کرنے والے ابتدائی لوگ اس حوض کے کارندے کے طور پر کام کریں گے۔ پرانی فقہ کی روشنی میں یہ بات حضرت مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ کو سمجھ نہ آئی اور فرضی خلیے دیکھنے والی نئی خوردبین' ان کے تدین وتفقہ کو دستیاب نہ تھی، اس لیے وہ نہ سمجھ سکے اور انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا مطلب میری یادداشت وسماعت کے مطابق یہ تھا کہ: ''ایک فرضی وخیالی وجود کو متصرف قرار دینا اور عاقل بالغ انسانوں کو اس کے کارندے قرار دینا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' اس پر بعض حضرات نے تعبیر بدل کر ارشاد فرمایا کہ: حضرت! اس غیر مرئی معنوی شخص کو آپ صندوقچی کہہ سکتے ہیں، چندہ کی رقم صندوقچی کے پاس جمع ہوتی ہے، وہ صندوقچی اس رقم کی مالک بن جاتی ہے، وہ صندوقچی لین دین کرتی ہے اور آگے کے معاملات نمٹاتی ہے۔ اس پر حضرت مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ نے اپنی علمی وروحانی شان کے مطابق ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ''بھئی! یہ تمہاری صندوقچی شندوقچی ہماری سمجھ میں نہیں آرہی۔'' مگر دسمبر ۲۰۰۲ء والی مجلس کی روئیداد میں اس موقف کی بابت کوئی صراحت نہیں ملتی، بلکہ اس کے برعکس مجلس کے علماء کے اتفاق کا تأثر ملتا ہے۔

بہرحال اس طرح کی ابتدائی تنقیحات کے ساتھ ہی وقف پر مبنی مجوزہ تکافل کی مشاورتی مجلس بے نتیجہ ختم ہوگئی اور انشورنس کے متبادل مجوزہ تکافل کے نام سے انشورنس کی اسلام کاری کا بحرین وملائیشیا وغیرہ سے آیا ہوا یہ دوسرا انداز بھی پاکستانی علماء کی سمجھ میں نہ آسکا اور پاکستانی علماء سے مجوزہ تکافل کی تائید نہ مل سکی، اور وقف پر مبنی مجوزہ نظام کو تبرع وغیرہ پر مبنی نظام سے زیادہ قابل اشکال قرار دیا، بلکہ اس وقف کی مزعومہ بنیاد ہی کو سرے سے ناقابل فہم قرار دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میزبان ادارے کی طرف سے تکافل کی جوازی سرگرمیوں میں اس مہنگی مجلس مشاورت کا حوالہ ضمناً دبے دبے الفاظ میں ہی دیا جاتا ہے اور بعض تحریروں میں ''معمول'' کے مطابق مخالف رائے کو معمولی سمجھتے ہوئے ''معمولی''

انداز میں بیان کیا گیا ہے، یا پھر محض شرکت کو بھی منظوری اور تائید سے تعبیر فرمایا گیا ہے، بلکہ ۲۰۰۵ء سے منسٹری آف دی کامرس کی مہر تصدیق اور فقہی تصویب کا ماہرانہ تأثر دے کر تکافل پالیسی کو ملک کی جائز قانونی پالیسی کی سند بھی دی گئی ہے۔ نیز تکافلی نظام پر وارد ہونے والے اشکالات کے جوابات کا تأثر اور تعامل بھی مجوزین کی طرف سے واضح انداز میں نظر آ رہا ہے۔ مگر یہ تأثر وتعامل، ایک خاص ''روایت'' کا تسلسل ہے جسے واقفانِ حال جانتے اور سمجھتے ہیں، ہم اس دیرینہ دلدل میں ''کُھبے'' بغیر اس پرانے اشکال کو دہرانا چاہتے ہیں جو وقف فنڈ اور شخص معنوی کی فقہی حقیقت سے متعلق تھا، جس اشکال کے بعد مروجہ نظام کو وقف پر مبنی قرار دینے کا جواز نہیں بچتا، مگر اسے نظر انداز کرتے ہوئے مذکورہ مجلس کی روئیداد کی ترتیب میں بعض جزوی مسائل کو اہل علم کا موضوعِ بحث ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ مجوزہ تکافل سے متعلق جو جو اشکالات وجوابات مرتَّبہ روئیداد میں اُٹھائے گئے ہیں وہ ثانوی درجے کے ہیں، ان کا تعلق تکافل کی عملی تکییف سے ہے اور عملی تکییف پر بحث تب ہوسکتی تھی، جب آپ اس کی فکری ونظریاتی تکییف (وقف پر مبنی تکافل) کے فریضہ میں سرخرو ہو چکے ہوتے، جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس طرزِ عمل سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بعض مجوزین حضرات ''معمولی انداز میں'' اپنے ''مفروضے'' کو ''مسلَّمہ'' کا درجہ دے کر دوسرے مرحلے کے جزوی وفروعی مسائل سے جا کر بحث شروع فرما رہے ہیں اور نیک دل اہل رائے انہی جزئیات کی بحث وتمحیص میں جا لگے ہیں۔ یہ کتنی زیادتی والی بات ہے کہ مروجہ تکافل سے متعلق ''وقف فنڈ'' کی بنیاد پر شخص معنوی کے ذریعہ لین دین کی فقہی بحث کو پسِ پشت ڈال کر یہاں سے بات شروع کرنا کہ مساہمین (کمپنی کے شیئر ہولڈرز) تکافل فنڈ سے فنڈ کے انتظام وانصرام کی اُجرت لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کو وکالہ فیس کہیں گے یا کچھ اور نام دیں گے؟ اجرت تو آپ نے پہلے سے طے شدہ قاعدے کے مطابق ہر حال میں دینی تھی، وہ تو ثانوی امر ہے، اس ثانوی امر سے بحث کا کیا مقصد ہے؟ ہاں! اس نوع کے سوالات سے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہورہا ہے کہ تکافل فنڈ کی حیثیت گویا مسلم ہے، اس میں تشنہ پہلو صرف یہ رہ رہا ہے کہ مساہمین کو اجرت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ دوسرا فائدہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تکافل فنڈ کے ''مسلَّم وجود'' کے مساہمین جب محنت کریں گے تو اُجرت کیوں نہیں لے سکتے؟ لہٰذا مساہمین اجرت لے سکتے ہیں اور یہ اُجرت تکافل فنڈ سے ادا کی جائے گی، کیونکہ یہ لوگ فنڈ کے اجیر ہیں، نہ کہ حملۃ الوثائق کے، اب اُجرت جب طے ہوگئی تو اس کی تعیین بھی لازمی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ان جزوی مثالوں سے بعض مجوزین حضرات کا ''عملِ تمویہ'' سمجھنے کی کوشش کریں اور دیکھتے جائیں کہ وہ حسب منشأ کسی چیز کو جب جائز قرار دینا چاہیں تو کس مہارت سے اُصولی بحث سے بھاگ کر جزئیات کی ''دُم'' کے بال پکڑ لیتے ہیں، بات کو مزید سمجھنے کے لیے اس رویے سے اگر سوال کیا جائے کہ کتا حلال ہے یا حرام ہے؟ تو اس رویے کے مطابق اس سوال کا جواب یہاں سے شروع ہوگا

کہ کتے کی کھال کو دباغت کیسے دی جائے گی؟ اور اس کے استعمال کے طریقے کیا ہوں گے؟ یہ یقیناً فقہی مسئلہ ہے، لیکن ہمارا سوال یہ نہیں ہے۔

بہرصورت مجوزہ تکافل کمپنی سے متعلق اہل علم کا بنیادی اشکال اپنی جگہ برقرار ہے، یعنی تکافل کمپنی کے قیام سے لے کر اس کمپنی کے شیئر ہولڈرز (مساہمین) کا کمپنی کے ساتھ تعلق اور کمپنی (وقف فنڈ) کی معنوی وقانونی حیثیت کے مراحل کی فقہی پڑتال ابھی تک باقی ہے، نیز وقف فنڈ کا قیام اور اس کو شخص معنوی کی حیثیت سے ملنے والے مالکانہ تصرفات جن کی بنا پر وقف فنڈ (شخص معنوی) کو وقف کے اصول وضوابط کے مطابق وقف کی املاک ومنافع میں تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔

یہ بنیادی اشکال درحقیقت اس اصول ونظریہ میں جا سمٹتا ہے کہ ''وقف فنڈ'' شخصِ معنوی ہے اور شخصِ معنوی مالک ومتصرف ہوتا ہے۔ اور اس شخصِ معنوی (وقف فنڈ) کے ساتھ وابستہ لوگ اس کے معاون (چندہ دہندگان) ہیں، کیا واقعی وقف فنڈ کو فقہی اعتبار سے شخصِ معنوی کا درجہ مسلَّمہ طور پر حاصل ہے؟ اگر وقف فنڈ واقعۃً وقف بن چکا ہے تو اس کے اعضاء وارکان کی حقیقت بھی مسلم ہے؟ اور کیا شخصِ معنوی کو وہ جملہ خصائص واختیارات حاصل ہوتے ہیں جو کسی بھی عقد کے حقیقی عاقد کو حاصل ہوتے ہیں؟ مجوزہ تکافل کی ساری فروع اور جزئیات اس اصل سے جڑی ہوئی ہیں، اس اشکال کو رفع کرائے بغیر تکافل کی جزئیات میں اُلجھنا اور اُلجھانا ''تمویہ خاص'' کی بدگمانی کو جنم دیتا ہے، یہ تو صاف صاف مخالف رائے والوں کو غیرمقصودی اُمور میں اُلجھا کر اپنے مقصد کے درپے رہنے کی روش کا تکرار' ہی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ناانصافی کی بات یہ ہوگی کہ ''وقف'' سے متعلق اس طرح کے بھونڈے نظریئے پر ''تکافل'' کی بنیاد رکھی جائے اور اُسے اشکالات سے محفوظ اور اکابر کی طرف منسوب بتایا جائے۔

جہاں تک شخصِ معنوی یا شخصِ قانونی کی فقہی حقیقت کا تعلق ہے، اس طرف آنے سے قبل اس نفس الامری حقیقت اور پس منظر کو پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ شخصِ معنوی اور اس کی محدود ذمہ داری' مغربی معاشی فکر کی خاص اصطلاح ہے، خاص ایجاد ہے اور مخصوص اہداف ومقاصد کے لیے اُسے تجارتی دنیا میں رائج کیا گیا ہے اور اُسے قانونی شکل بھی دی گئی ہے، جس کی بنا پر یہ شخصِ معنوی' شخصِ قانونی بھی بن جاتا ہے۔ اس کی حقیقت کو مختصر الفاظ میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کاروباری معاملات میں خرید وفروخت سے متعلق ''اہلیت'' کے جتنے خصائص ہیں وہ حقیقی انسانوں کی طرح معنوی وفرضی شخص (کمپنی) کے لیے مانے جائیں، جس طرح عقود میں معاملات کی نسبت' حقیقی عاقدین (دو فرد یا جماعت) کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح معنوی شخص کی طرف بھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ شخصِ معنوی تو محض مفروضہ ہے، معاملات تو حقیقی انسان ہی نبھائیں گے، اس کے باوجود معاملات کی نسبت حقیقی انسانوں کی بجائے غیرحقیقی معنوی اور فرضی شخص کی طرف ہوگی اور یہاں تجارتی معاملات انجام دینے والے حقیقی انسانوں کو اس معنوی

وفرضی شخص کے کارندے، کارکن اور ملازم کی حیثیت دی جائے گی۔ ان حقیقی انسانوں کو عاقد تسلیم نہیں کیا جاتا، بلکہ عاقد وہ شخص معنوی ہی کہلائے گا اور اس غیر واقعاتی فرضی تصور کو بین الاقوامی سطح پر چونکہ قانونی حیثیت مل چکی ہے، اس لیے عاقد یہی معنوی وقانونی شخص ہوگا۔ جب معاملات کا عاقد یہی معنوی شخص ہے تو لامحالہ عقد کے حقوق کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوگی، اگر کاروبار میں کسی کو کچھ لینا دینا ہوگا، مسئولیت ہوگی تو اس کی ذمہ داری' شخصِ معنوی پر ہی عائد ہوگی۔ اس شخصِ معنوی کے پیچھے چھپ کر اربوں کھربوں روپے کمانے والے لوگ اگر شکم سیر ہوکر غائب ہوجائیں یا کمپنی تحلیل ہوجائے یا دیوالیہ ہوجائے اور کمپنی کے کاروبار میں شریک لوگوں کے مالی حقوق کمپنی کے نام باقی ہوں تو ان حقوق کا مطالبہ شخصِ معنوی کے ذریعہ نفع اندوزی کرنے والے کارندوں سے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس بے جان معنوی شخص سے ہی مطالبہ کیا جائے گا اور وہ مطالبہ بھی اپنے حقوق کی بقدر نہیں، بلکہ کمپنی (شخصِ معنوی) کے بچے کھچے فی الوقت موجوداً ثاثوں میں سے اپنے اور دیگر غرماء کے دیون کے تناسب سے بقدر حصہ رسدی مطالبہ ہوسکے گا۔ اگر کسی حق دار کے حقوق زیادہ بنتے ہوں تو شخصِ معنوی' قانونی طور پر اُسے پوری ادائیگی کرنے کا پابند نہیں ہے، اس کی ذمہ داری صرف اپنے قانونی وجود کی تحلیل ودیوالیہ کے وقت موجوداً ثاثوں تک محدود ہوگی، اس لیے کہ وہ ''لمیٹڈ'' ہے اور اس کی قانونی حیثیت کو کوئی پھاند نہیں سکتا۔

حاصل یہ کہ کمپنی قانوناً شخصِ معنوی ہے اور اس کی ذمہ داری محدود ہے۔ منافع کی دوڑ میں شخصِ اعتباری، حقیقی انسان سے زیادہ طاقتور اور جاندار ہوگا اور جواب دہی کے موقع پر اس کے برعکس ہوگا۔ یہ تصور' حقیقت کی دنیا میں کیا مقام رکھتا ہے، عقلی اعتبار سے اس میں کتنی معقولیت ہے اور شریعتِ حقہ میں اس کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے؟! یہ بالکل بے غبار سی حقیقت تھی اور ہے۔

مگر پھر بھی بعض اہل علم اس کی فقہی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بعض اس تصور کی تائید میں چند فقہی نظائر بھی پیش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جس پر تعجب کے لیے یہی کافی ہے کہ جس تصور کی نامعقولیت کو عام عقل مند انسان تسلیم نہ کرسکے وہ اہل علم کے ہاں علمی موضوع کیسے بن گیا؟ اس کی فقہی تخریج کیسے ہونے لگی؟ تو کچھ تلاش وجستجو کے بعد انشورنس کی اسلام کاری جیسی ایک وجہ بہرحال یہاں بھی دریافت ہوگئی کہ تقریباً نصف صدی قبل مصر میں ''تقریب بین الاسلام والمغرب'' کے لیے شروع ہونے والی تحریک کے فکری ثمرات میں شخصِ اعتباری اور محدود ذمہ داری کی تحقیق وتخریج کا سراغ بھی مل رہا ہے، اس کارِخیر کی بنیادوں میں یوں تو شیخ مطیعی مصری، مفتی عبدہ وغیرہ کے اسماء گرامی بھی ذکر کیے جاتے ہیں، مگر ہماری تلاش کے مطابق شخصِ معنوی اور اس کی محدود ذمہ داری کے تصور کو باقاعدہ علمی وفقہی موضوع کے طور پر مفصل انداز میں مشہور شامی بزرگ استاذ مصطفیٰ الزرقاء نے اختیار کیا تھا اور انہوں نے بڑے جزم کے ساتھ اس مغربی فکر کو اسلامی فکر قرار دیا تھا اور اس کے لیے

مختلف فقہی شواہد ونظائر ذکر فرمائے تھے، بعد کے بعض اہل علم نے تقریباً انہی کے مضمون اور کام کو اپنے انداز میں اجمال یا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، ان حضرات کی فقہی تخریج کے مطابق ''وقف'' شخصِ قانونی کی پہلی نظیر ہے۔

واضح رہے کہ استاذ مصطفیٰ الزرقاء یہ وہی بزرگ ہیں جن کے بارے میں پیچھے گزرا کہ وہ روایتی انشورنس کو بھی فی الجملہ جائز فرماتے تھے اور ان کے خیال کے مطابق انشورنس میں جہاں رِبا کا معاملہ ہوا ُسے ممنوع سمجھا جائے، ان کے ہاں انشورنس کے جائز ہونے کے لیے صرف ''غیر سودی'' ہونا کافی ہے، باقی انشورنس' شرعی اعتبار سے جائز ہے۔

جو اہل علم یہ جانتے ہیں کہ مصر وشام سے بینک کے سود کے جائز ہونے کی صدائیں اُٹھی تھیں اور روایتی انشورنس کو امداد باہمی کی جدید شکل قرار دیا گیا تھا، انہی مصری وشامی مفکرین کے افکار کی تلچھٹ سے شخصِ اعتباری کو اسلامی گھٹی دی گئی ہے، اس گھٹی سے شخصِ قانونی پر اسلام کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے؟ اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ ہمارے قدامت پسند معاشرے میں یہ امر کوئی قابل توجہ نہ تھا، اس پر کسی صاحبِ علم کو التفات کی حاجت بھی نہ تھی، مگر ہوا یہ کہ ہمارے ہاں کے ایک نامور متدین صاحب علم بزرگ نے اپنے تردد کے ساتھ اہل علم کے غور وفکر کے لیے ''شخصِ قانونی'' کی فقہی حیثیت کو جب موضوع بنایا تو اس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ شاید ''شخصِ قانونی'' کا تصور' بالجزم' اسلامی ہے۔

حالانکہ ہمارے جس بزرگ نے شخصِ قانونی اور اس کی محدود ذمہ داری کے تصور کو اپنے تردد کے ساتھ محض اہل علم کے غور وفکر کے لیے پیش فرمایا تھا، ان کا تردد ہمارے علم کے مطابق تاحال تشفی میں تبدیل نہیں ہوا، بلکہ ملک کے مقتدر اہل فتویٰ کی جانب سے اس تصور پر جو فقہی نقد کیا گیا ہے (جو بنوری ٹاؤن سے چھپنے والی کتاب مروجہ اسلامی بینکاری کے صفحہ: ۱۱۸ تا ۱۵۹ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے) اس کے بارے میں غیر سودی بینکاری نامی کتاب میں بزرگ موصوف نے لفظی نقاش کے باوجود یہ صراحت فرمائی ہے کہ:

> ''اس مسئلے کے بارے میں بندے نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں یہ بات صاف صاف لکھی ہے کہ یہ میری طرف سے کوئی حتمی فتویٰ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سوچ ہے جو اہل علم کے غور کے لیے پیش کی جارہی ہے۔............................ جہاں تک محدود ذمہ داری کے تصور کا سوال ہے، مجھے خود پہلے بھی اس پر جزم نہیں تھا، اور جو ابتدائی میلان ظاہر کیا تھا اس پر بھی نظر ثانی کی ضرورت سمجھتا ہوں اور جو دلائل اس کے خلاف دیئے گئے ہیں ان میں سے بعض دلائل واقعۃً وزنی ہیں۔'' (غیر سودی بینکاری، ص: ۳۳۹ تا ۳۴۳، ط: معارف القرآن کراچی)

اہل علم کے لیے دعوتِ فکر ہے کہ وہ غیر جانبدارانہ غور فرمائیں کہ ''تکافل فنڈ'' کی بنیاد' شخصِ اعتباری اور شخصِ قانونی کے تصور کی اسلام کاری پر قائم ہے اور اس تصور کے آغاز سے لے کر اب تک

کے نظریات وخیالات کی علمی وفقہی پوزیشن بھی اہل علم کے سامنے ہے، اس سے صرف نظر کرتے ہوئے مروجہ تکافل کی شرعی حیثیت متعین کرنے والے ایک قابل قدر صاحب علم کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں، مروجہ تکافل کمپنیوں کی فقاہت شعاری دیکھیں اور مروجہ تکافل کی فکری وفقہی بنیاد کے بارے میں مناسب فیصلہ صادر فرمائیں:

’’تکافل ماڈل کی خصوصیات

خلاصہ یہ کہ تکافل ماڈل میں درج ذیل خصوصیات (Features) پائی جائیں اور درج ذیل مقاصد حاصل ہوں:

۱:...... چندہ دہندگان کا چندہ دینا کسی شرط کے ساتھ مشروط نہ ہو۔

۲:...... پول کا کوریج (Coverage) مستقل عطیہ کی حیثیت سے ہو، یعنی وہ کسی سابقہ عقد کا نتیجہ (Conclusion) نہ ہو۔

۳:...... چندہ کی ملکیت شرکاء کی ملکیت سے خارج ہو۔

۴:...... پول اس چندہ کا مالک ہو، کیونکہ ’’خروج الشیء لا إلی الملک‘‘ درست نہیں، یعنی یہ کہ ایک شئے کسی کی ملکیت سے نکل جائے اور کوئی دوسرا اس کا مالک نہ بنے۔

ان خصوصیات پر مشتمل ماڈل نہ عقد معاوضہ بنے گا، نہ اس میں زکوٰۃ اور میراث کے مسائل پیدا ہوں گے۔

یہ مقاصد اس وقت حاصل ہوسکتے ہیں جبکہ اس پول کا ایک معنوی اور قانونی وجود (Legal Entity) ہو جس کو شخصِ قانونی کہتے ہیں۔

یہ ایسا شخص ہو کہ جو مالک بھی بنتا ہو اور مالک بنا تا بھی ہو (چنانچہ جو تکافلات محض تبرعات پر مبنی ہیں، ان کا کوئی مستقل قانونی وجود نہیں) اور وہ اساس اور بنیاد صرف ’’وقف‘‘ ہے، لہٰذا پول ’’وقف‘‘ پر مبنی (Based) ہونا چاہیے، کیونکہ وقف ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا الگ وجود شریعت بھی مانتی ہے اور قانون بھی مانتا ہے، نیز وقف میں کافی گنجائش ہے، یعنی اس کا دائرہ (Scope) وسیع (Extensive) ہے، اس میں بسا اوقات ایسی شرائط کی بھی گنجائش ہوتی ہے جو دوسرے عقود (Contracts) میں نہیں چلتیں، اس لیے کہ وقف میں شرائط کی گنجائش، ہبہ اور تبرع کے مقابلہ میں زیادہ ہے، لہٰذا ہمارے نزدیک تکافل کی بہترین بنیاد اور نسبۃً مسائل اور پیچیدگیوں سے دور راستہ ’’وقف‘‘ ہی ہے۔‘‘

(تکافل کی شرعی حیثیت، ص: ۸۹، ۹۰)

غیر جانب دار اہل علم غور فرمائیں کہ وہ شخصِ قانونی جس کا وجود شرعاً مسلّم نہیں، اُسے تا حال

اسلامی کہنے کی صراحت اور گنجائش نہیں ملتی، اس کی حقیقت کو جزم کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا، جس کے تصور کو محض اہل علم کے غور وفکر کے لیے سامنے لایا گیا ہے، جس پر تا حال نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اس فرضی وجود کی نفی کرنے والے دلائل بھی واقعۃً وزن رکھتے ہیں، ایسا شخص قانونی مسلَّمہ حقیقت کیسے کہلاسکتا ہے؟ اور اس غیر حقیقی مفروضے پر تکافل ماڈل کی عمارت کیونکر کھڑی ہوسکتی ہے؟ پھر جس ''تکافل ماڈل'' کا وجود اس شخصِ قانونی پر منحصر ہو اور اس شخصِ قانونی ومعنوی کے بغیر تکافل کے مقاصد کا حصول ناممکن ہو، ایسے ''تکافل'' کو جزم کے ساتھ اسلامی کہنا کہاں تک صحیح ہوگا؟ ان سوالوں سے پہلو تہی کرتے ہوئے مزعومہ شخصِ معنوی کی جزئیات سے بحث کرنا چہ معنی دارد؟ یہ ایہام اور تمویہ ہے یا کچھ اور؟ **فللّٰہ در من أدری وأروی۔**

پس ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وقف فنڈ جس کا وقف بننا بجائے خود محلِ اشکال ہے، اس سے قطع نظر، وقف فنڈ، شخصِ قانونی ہونے کی بنا پر جب شرعاً مالک ومتصرف نہیں بن سکتا تو اس کو مالک ومتصرف ماننے کا مفروضہ کالعدم ہوا، جس کی پاداش میں ''**تملیک ما لایملک**'' (ایسی چیز کو مالک بنانا جو مالک نہیں بن سکتی) یا ''**خروج الشیء إلٰی غیر الملک**'' (مالک کی ملک سے کوئی چیز نکلے اور وہ ملک نہ بنے) کی فقہی رُکاوٹ سامنے آگئی، حالانکہ یہاں ادائیگی اور وصولی کے معاہدات حقیقی اشخاص کے درمیان باقاعدگی سے طے پاچکے ہیں تو ''**الإعمال خیر من الإھمال**'' اور حکم شرعی کا محمل نکالنے کے لیے فرضی شخص کی بجائے حقیقی اشخاص کی طرف معاملات کی نسبت کی جائے گی اور نتیجۃً تکافل کمپنی کے بانی ہی انشورنس کمپنی کی مانند مزعومہ وقف فنڈ کے چندوں کے مالک ومتصرف ہوں گے اور وہ ان چندوں (قسطوں) کے صلہ میں جو بدلہ وعوض دیں گے، اس سے مروجہ تکافل، عقدِ معاوضہ ہی بنے گا۔ یہ معاوضہ آپ کی جمع شدہ قسطوں کی رقم سے کم یا زیادہ بھی ہوسکتا ہے، عموماً زیادہ ہی ہوتا ہے اور اسی زیادتی کی امید پر جن لوگوں نے تکافل پالیسی خریدی تھی اور تکافل کی ممبر شپ حاصل کی تھی وہ ممبر شپ حاصل کرتے وقت طے شدہ معاہدے کے تحت اس اضافی عوض وبدل کے مستحق قرار پائیں گے، وہ اضافہ کتنا ہوسکتا ہے؟ کب اور کس وقت ملے گا؟ اس کا فی الحال صحیح اندازہ اور علم نہیں ہے، یہی انشورنس کا حاصل ہے، جسے تکافل کہیں یا انشورنس اس سے حکم میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

چلیے! اگر وقف فنڈ کے چندے میں مجوزین کے بقول صرف ثواب کی نیت ہے، چندہ دہندگان کا چندہ واقعۃً غیر مشروط ہوتا ہے، چندہ کی ملکیت شرکاء کی ملکیت سے خارج ہے اور پول کا کوریج واقعۃً مستقل عطیہ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ کسی سابقہ عقد پر مبنی نہیں ہے، جیسا کہ گزشتہ اقتباس اور دیگر اعلانات میں یہ تأثر دیا جاتا ہے تو پھر آئیے! شروع میں اس چندے کے تبرعِ محض ہونے کا واضح اعلان کریں اور چندہ دینے والوں کو واضح انداز میں یہ باور کرائیں کہ آپ لوگ انشورنس طرز کی کوئی پالیسی نہیں خرید

رہے، بلکہ مسجد و مدرسہ کی طرح ''پول'' کو چندہ دے رہے ہیں اور اس کا طے شدہ صلہ صرف آخرت میں ملے گا اور مقررہ ادائیگی کے وقت اس اعلان کو سچا دکھانے کے لیے کسی ایک معاون (چندہ دینے والے) کو محروم کرکے تو دیکھیں، عوض و بدل کی لالچی بلیاں ''تکافل'' کے تھیلوں سے باہر آجائیں گی۔ اور یہ حقیقت خود بتائے گی کہ انشورنس کی قسط کو چندہ کا نام دینا اور اس چندہ کے صلے میں تکافل کمپنی سے ''عطاء مستقل'' کے نام پر فوائد و مراعات حاصل کرنا اور اس کے لیے تمام تر تحریری اور زبانی اعلانات وتصریحات کرنا، محض بہکاوا، بہلاوا اور پھسلاوا ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ مروجہ تکافل بعینہٖ روایتی انشورنس ہے، صرف نام اور اصطلاحات کی تبدیلی فرمائی گئی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مجوزین حضرات نے مروجہ تکافل میں انشورنس کی اصطلاحوں کی تبدیلی کے علاوہ مسلمانوں کو ''نیت'' کی تبدیلی یوں سکھائی ہے کہ وہ انشورنس کی قسط کو چندہ کی نیت سے دیا کریں اور انشورنس کی ادا شدہ قسطوں کے صلے میں سابقہ معاہدے کے مطابق ملنے والی مراعات وفوائد کے بارے میں یہ سمجھ لیں اور یہ نیت کرلیں کہ وہ تکافل کمپنی کی طرف سے ''عطاء مستقل'' ہے، آپ کے کسی سابقہ معاہدے کا جبری نتیجہ نہیں ہے۔

آخر اس مصنوعی تبدیلی کا حقیقت سے کیا واسطہ؟ کیا واقعۃً ایسی مصنوعی کارروائی اور زبانی جمع خرچ کے ذریعہ انشورنس کے روایتی نظام کا اسلامی متبادل بن سکتا ہے؟ خدارا!!! غور فرمائیے کہ اگر اس طرح نیتوں کی زبانی تبدیلی سے شرعی احکام میں تبدیلی کا امکان تسلیم کرلیا جائے تو پھر تمام ''محرماتِ شرعیہ'' کو اچھی نیت سے اختیار کرنا جائز ہوجائے گا اور اس کارِ خیر کا اچھا خاصا ''بونس'' ہمارے ''اکاؤنٹ'' میں بھی آئے گا۔

واضح رہے کہ اس طرح نیتوں کی تبدیلی کے ذریعہ کسی نظام کی تبدیلی کا نظریہ اور طرزِ فکر انشورنس کی اسلام کاری کے مذکورہ بالا نظریہ وفکر سے زیادہ وسیع حد تک جدت آمیز اور فساد آلود ہے، وہ یوں کہ اس طرزِ فکر میں مصری آزاد خیالی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور دیسی بے راہ روی کے جراثیم بھی موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ فکر تقریباً آج سے تیس چالیس سال پرانی ہے، اسی فکر کے تحت لاہور کے ایک معروف ڈاکٹر صاحب نے بینک کے سود کو حلال قرار دیا تھا، جن کا کہنا یہ تھا کہ بینک اور اکاؤنٹ ہولڈر رقم جمع کراتے وقت یہ پکا معاہدہ کرلیں کہ وہ آپس میں سود کا لین دین نہیں کریں گے، پھر ادائیگی کے وقت بینک سودی مارکیٹ کی شرح سود کے بقدر ازخود اضافی ادائیگی کردے تو یہ سود نہیں کہلائے گا، بلکہ ''قضاء حسن'' بن جائے گا۔ اس پر انہوں نے حدیث وفقہ کی کتابوں سے زبردست تخریج بھی فرمائی تھی، مگر ہمارے بزرگوں نے اس طرزِ فکر کے تحت سودی بینک کی اسلام کاری کو یکسر مسترد کردیا تھا اور اس معاہدے کو ''**المعروف کالمشروط**'' کے بنیادی شرعی قاعدے کے خلاف قرار دیا تھا، اور اس فکر کو محض لفظوں کا گورکھ دھندہ قرار دیا تھا، پس اپنے اکابر کی اتباع میں مروجہ تکافل کے نام پر نیت کی

تبدیلی کی تصریح کے ساتھ انشورنس کی اسلام کاری کو ہم ''لاہوری فکر'' کی طرح خلافِ شرع سمجھتے ہیں، بلکہ اس طرزِ عمل کو ۱۹۶۰ء والے ''مصری طرزِ عمل'' سے بدتر سمجھتے ہیں، کیوں کہ مصری مجوزین علماء کرام کے دلائل میں جو ظاہری وزن تھا وہ ہمارے مجوزین کے دلائل میں قطعاً نہیں ہے۔ مصری علماء کے دلائل کا وزن جاننے کے لیے پچھلے صفحات کو دوبارہ پڑھیں اور ہمارے معاصرین کی حیلہ جویانہ رکیک تاویلات کا جائزہ بھی لیں تو ہماری گستاخی' قابل ملامت نہیں ٹھہرے گی، ان شاء اللہ!

الغرض! یہ حقیقت کسی طور پر بھی چھپائی نہیں جاسکتی کہ جو بھی تکافل کا ممبر بنتا ہے اور تکافل کمپنی کو بقول شما چندہ دیتا ہے، تمام تر حیلہ جویانہ تأویلات کے باوجود ''**المعروف کالمشروط**'' کے مسلمہ فقہی اصول کی رو سے وہ ''معاوضہ'' سے مشروط ہی کہلائے گا اور ''مروجہ تکافل'' انشورنس کی تینوں خرابیوں (ربا، قمار اور غرر) سے خالی نہیں کہلائے گا، بلکہ انشورنس کی اسلام کاری کے پرانے طرز کو نیا بنانے کے لیے رکیک تأویلات کی وجہ سے حیلۂ باطلہ اور اکل بالباطل کا مظہر بھی شمار ہوگا۔

بنابریں بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انشورنس کا ربا و قمار اور غرر' مروجہ تکافل میں بعینہٖ موجود ہے، اس لیے ''مروجہ تکافل'' بعینہٖ انشورنس ہے، صرف نام کی تبدیلی ہے۔ ظاہر ہے کہ نام تبدیل کرنے سے حکم تبدیل نہیں ہوتا، جیسے صرف نام تبدیل کرنے سے کوئی کافر' مسلمان نہیں بن جاتا۔ لہٰذا انشورنس کے بارے میں کہے ہوئے اپنے بزرگوں کے الفاظ' مستعار لیتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مروجہ تکافل کے ''عوض کش'' چندہ کو تبرع، تعاون اور تناصر کہنا محض دھوکہ ہے۔ یورپی نظام کے چند خوشنما پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے ''تکافل'' کے نام پر انشورنس کی حلت وجواز کا فتویٰ دیا جارہا ہے اور بیمہ، سٹہ اور سودی کاروبار والی نحوست کو مسلم قوم کے سرتھوپنے کا خوبصورت حیلہ دہرایا جارہا ہے۔ پس انشورنس کو ''انشورنس'' کے نام سے جائز قرار دینے کا جو حکم تھا، انشورنس کو ''تکافل'' کے نام سے جائز قرار دینے کا حکم بھی وہی ہوگا اور مروجہ تکافل کا وہی حکم ہوگا جو انشورنس کا حکم بیان کیا گیا تھا۔ واللہ اعلم

مروجہ تکافل کمپنیوں سے متعلق اس اُصولی واَساسی بحث کے بعد کسی اور بحث کی طرف جانے کی اصولاً گنجائش نہیں ہے، مگر مجوزین حضرات نے کفالہ، مضاربہ، وقف اور اس طرح کی دیگر فقہی اصطلاحات کے ذریعہ اپنے موضوع کو جزئیات تک پھیلا دیا ہے، اس لیے بعض اہل علم نے اتمامِ حجت کے لیے اس اُصولی بحث کے علاوہ تکافل کی جزوی بحث سے تعرض بھی فرمایا ہے اور مجوزین حضرات کے ابہامات کا مناسب علمی رَد پیش فرمایا ہے۔ ہمارے ناقص علم کے مطابق اب تک اردو میں تین گراں قدر کام سامنے آئے ہیں:

۱:......حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب مدظلہم کا کام جنہوں نے اُصولی اور فروعی مباحث کو احاطہ کرتے ہوئے رَد فرمایا جو اپنی نوعیت کا جامع اور نکھرا ہوا ہر قسم کے حشو وزوائد سے پاک مرتب کام ہے، ڈاکٹر صاحب کا نام وکام کسی تعارف کا محتاج نہیں: ''آفتاب آمد دلیل آفتاب''۔

۲:......حضرت مولانا مفتی احمد ممتاز صاحب مدظلہم نے بھی اس موضوع پر وقیع علمی کام کیا ہے جس کا عنوان ہے: ''مروجہ تکافل اور شرعی وقف'' حضرت مفتی صاحب نے اُصولی وفروعی دونوں پہلوؤں سے مروجہ تکافل کی اسلام کی طرف نسبت کو غلط ثابت فرمایا ہے اور مروجہ تکافل کے ناجائز ہونے کی اٹھارہ وجوہات نقل فرمائی ہیں۔ مفتی صاحب موصوف کے اندازِ بیان میں تدریسی وترکیزی انداز غالب رہتا ہے، اس کتاب میں بھی انہوں نے یہی اُسلوب اختیار فرمایا ہے، اس تحریر کی اگلی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر مختلف اہل فقہ وفتویٰ کی تقریظات وتائیدات بھی ثبت ہیں۔ نیز موضوع کو آسانی سمجھنے کے لیے اصطلاحات کا تعارف بھی کرادیا گیا ہے اور تکافل کا بنیادی ڈھانچہ بھی پیش فرمایا ہے۔ اسی طرح وقف کی اقسام اور ان کے احکام سے تعرض بھی شروع میں شامل ہے، تاکہ وقف پر مبنی تکافل کی فقہی تکییف میں ''مغالطات'' سمجھنے میں دشواری نہ ہو، نیز مروجہ تکافل کی بنیادوں کا جائزہ بھی اس تحریر میں احسن انداز سے شامل ہے۔ مزید برآں تکافل کے جوازی دلائل کے جوابات بھی دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح پاک قطر تکافل شریعہ کمپلائنس ڈپارٹمنٹ کی ایک تحریر کا جواب بھی شاملِ اشاعت ہے۔ اور بھرپور علمی طاقت سے ثابت کیا گیا ہے کہ مروجہ تکافل کمپنیاں انشورنس کا ''شرعی'' نہیں بلکہ ''غیر شرعی'' متبادل ہیں۔ انشورنس اور مروجہ تکافل میں جو فروق ذکر کیے جاتے ہیں وہ محض تکلفِ بارد ہیں، اس بنا پر مسلمانوں کو مروجہ تکافل کمپنیوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی بھی یہی رائے ہے۔

۳:......اس موضوع پر تیسرا قابل قدر کام ''مروجہ تکافل کا فقہی جائزہ'' کے نام سے سامنے آیا ہے جو جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی کے شعبہ تصنیف وتالیف کے رکن' محترم مولانا مفتی محمد راشد ڈسکوی مدظلہم کی تحقیقی کاوش ہے، اس تحریر کے درج ذیل امتیازات ہیں:

۱:-تحریر کا مدار خاطر خواہ تلاش وجستجو پر ہے، متعدد اہلِ فتویٰ اور ماہرین فن سے مذاکرہ واستفادہ کے ذریعہ تبادلۂ خیال کیا گیا اور مختلف اہل علم کی آراء کی روشنی میں اپنا مؤقف ترتیب دیا گیا ہے۔

۲:-بابِ اول کے شروع میں اپنے تحقیقی نچوڑ کو مناسب انداز میں باحوالہ پیش فرمایا ہے، جس کی اُصولی بحث کا خلاصۂ کلام یوں بیان کیا گیا ہے:

''انشورنس عقدِ معاوضہ تھا جس کی وجہ سے ربا، قمار اور غرر سب خرابیاں تھی اور اب بقول مجوزین تکافل میں وقف ماڈل کی وجہ سے عقدِ معاوضہ نہ رہا، کیونکہ یہاں کمپنی کے مالکان چندوں کے مالک نہیں بنتے بلکہ فنڈ (شخصِ قانونی) اس کا مالک بنتا ہے۔''

مجوزین کے اس مدعا کو ''قابلِ غور اُمور'' کے زیرِعنوان خلافِ واقعہ ثابت کیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب شخصِ قانونی کی فقہی حیثیت ہی مسلم نہیں تو وہ چندہ کا مالک کہاں سے بنا؟ پھر پالیسی ہولڈر وہ ہر حال میں چندہ دینے کی بنیاد پر فنڈ سے استفادہ کا حق دار بن گیا تو اس کا استحقاق چندہ

کے عوض اور بدل کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟! نیز غرر کی نفی کے لیے تکافل کو عقدِ تبرع قرار دیا گیا ہے، حالانکہ یہ بداہت کے خلاف ہے، کوئی بھی چندہ دینے والا اور لینے والا کبھی تبرع کی نیت کرتا ہے نہ کرسکتا ہے۔ اگر یہ بات شروع میں واضح کی جائے تو یقیناً کوئی بھی پالیسی نہیں خریدے گا، نیز فنڈ میں کمی کی صورت میں آپریٹر فنڈ کو قرضِ حسنہ دے گا جو درحقیقت خسارے کی تلافی کا ذریعہ ہے، یہ بھی عقدِ معاوضہ ہونے کی دلیل ہے۔ الغرض تکافل کو زبردستی عقدِ معاوضہ سے خارج کرنے کے لیے مجوزین کی طرف سے جتنے جتن کیے گئے تھے ان سب کو مدلل ومعقول انداز میں رد کیا گیا ہے۔

۳:- کتاب کے محتویات کی اجمالی فہرست ص:۷ پر یوں درج ہے:

''بابِ اول: انشورنس کے متبادل ''نظام تکافل پر ایک نظر''۔ بابِ دوم: اسلام کا نظام کفالتِ عامہ۔ بابِ سوم: کیا تکافل کا نظام اسلامی ہے؟۔ بابِ چہارم: شرعی اور مروجہ تکافل کا تقابلی جائزہ۔ بابِ پنجم: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کا فتویٰ۔''

۴:- یہ کتاب حسنِ ترتیب، موضوعات کی تقسیم اور مباحث کی تعوین اور املاء وترقیم کے عصری اسلوب سے بھی ماشاء اللہ! آراستہ ہے۔

۵:- زیادہ حصہ مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحب مدظلہم کی تحریر پر مشتمل ہے جو مبینہ طور پر ان کی اجازت سے کتاب کا حصہ بنا ہے، اس کے علاوہ حافظ ذوالفقار علی مدظلہٗ کی ایک تحریر بھی اس مجموعہ میں شامل ہے اور آخر میں ہمارے دارالافتاء کا ایک تفصیلی فتویٰ بھی کتاب کا جزء بنایا گیا ہے۔ ان تحریروں سے جہاں کتاب کے ظاہری حجم میں اضافہ ہوا ہے، اس سے بڑھ کر اس کتاب کا علمی وتحقیقی استناد بھی دوبالا ہوا ہے، ابتدائی تقریظات اور ان اضافات وضمیمات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مروجہ تکافل کمپنیوں کو انشورنس کی طرح ربا، قمار اور غرر کا مجموعہ قرار دینا محض مؤلف کی تحقیق وتخریج نہیں، بلکہ یہ ملک کے محقق روایت بردار اہلِ فتویٰ کی رائے ہے۔ انشورنس کی اسلام کاری کے لیے جن لوگوں نے تکافل کے نام سے محنت فرمائی ہے وہ محنت حقیقت سے دور محض مفروضہ وافسانہ ہے۔

ہماری رائے میں ڈاکٹر عبدالواحد صاحب سے لے کر مولانا محمد راشد ڈسکوی صاحب تک سنجیدہ اہلِ علم نے مروجہ تکافل کمپنیوں کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کے بعد کسی صاحبِ علم کو انشورنس کی اسلام کاری سے اتفاق کی گنجائش نہیں مل سکتی اور کوئی فقہی طالب علم کسی قسم کے علمی مغالطے کا شکار بھی نہیں ہوسکتا، بلکہ ان تحریرات سے خود مجوزین ومؤولین کو بھی یہ درس مل سکتا ہے کہ وہ آخرت کے نقصانات اور خطرات کے لیے کوئی ''تکافل پالیسی'' وضع کرنے پر غور فرمائیں، فَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِیْ إِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۔

أللّٰهم أحسن عاقبتنا فی الأمور کلها وأجرنا من خزی الدنیا وعذاب الآخرة

وصلی اللّٰه تعالٰی علٰی خیر خلقه محمد وعلٰی آله وصحبه أجمعین

جہنم میں لے جانے والے گناہ!

ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی

سورۃ ''الْهُمَزَة'' کا ترجمہ:

''بڑی خرابی ہے اُس شخص کی جو پیٹھ پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا، (اور) منہ پر طعنے دینے کا عادی ہو، جس نے مال اکٹھا کیا ہو اور اُسے گنتا رہتا ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اُسے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ہرگز نہیں! اُس کو تو ایسی جگہ میں پھینکا جائے گا جو چورا چورا کرنے والی ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم وہ چورا چورا کرنے والی چیز کیا ہے؟ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ، جو دلوں تک جا چڑھے گی۔ یقین جانو! وہ اُن پر بند کردی جائے گی، جبکہ وہ (آگ کے) لمبے چوڑے ستونوں میں (گھرے ہوئے) ہوں گے۔''

''وَيْـــلٌ'' کے معنی بربادی، بڑی خرابی اور عذاب کے ہیں، نیز جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ''وَيْل'' ہے، یعنی جو حضرات تین گناہوں (غیبت، کرنے، طعنہ دینے اور ناحق مال جمع کرنے) میں مبتلا ہیں، انہیں جہنم کی ''وَيْل'' نامی وادی میں ڈالا جائے گا۔ سورۃ الماعون میں مذکور ہے کہ نمازوں میں کوتاہی کرنے والوں کو بھی جہنم کی اسی وادی میں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

''هُمَزَةٌ'' اور ''لُمَزَةٌ'' مبالغہ کے صیغہ ہیں۔ ''هَمْزٌ'' کے معنی اشارہ بازی کرنے کے اور ''لَـمْـزٌ'' کے معنی عیب لگانے یا طعنہ دینے کے ہیں۔ کسی شخص کا مذاق اُڑانا، کسی کا عیب نکالنا، کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا یعنی غیبت کرنا، اسی طرح کسی کو طعنہ دینا، کسی کو ذلیل کرنا اور برا بھلا کہنا، یہ ساری شکلیں اس آیت کے تحت داخل ہیں اور یہ سب گناہِ کبیرہ ہیں، جن سے بچنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ ان گناہوں میں مبتلا ہونے والے اشخاص کو جہنم میں سخت عذاب دیا جائے گا، اگر موت سے قبل حقیقی توبہ نہیں کی۔

غرض یہ کہ اللہ کے بندوں میں بدترین لوگ وہ ہیں جو چغل خوری کرتے ہیں اور دوستوں ورشتہ داروں کے درمیان جھگڑا کراتے ہیں، شریفوں کی پگڑیاں اُچھالتے ہیں اور بے گناہ لوگوں کے

عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الحجرات، آیت: ۱۱ میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

''نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ جن کا مذاق اُڑا رہے ہیں خود اُن سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ جن کا مذاق اُڑا رہی ہیں خود اُن سے بہتر ہوں۔ اور تم ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو، اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کرنا بہت بری بات ہے۔ اور جو لوگ ان باتوں سے باز نہ آئیں تو وہ ظالم لوگ ہیں۔''

اس آیت میں ہمیں غیبت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ارشادِ نبوی کی روشنی میں سمجھیں کہ غیبت کیا چیز ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کیا ہے؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ کہا گیا: اگر وہ چیزیں اس میں موجود ہوں تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر وہ چیز اس کے اندر ہو تو تم نے غیبت کی اور اگر نہ ہو تو وہ بہتان ہوگا۔'' (صحیح مسلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ غیبت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے سامنے کسی کی برائیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کیا جائے جسے وہ برا سمجھے اور اگر اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو اس کے اندر موجود ہی نہیں ہیں تو وہ بہتان ہے۔ کسی مسلمان بھائی کی کسی کے سامنے برائی بیان کرنا یعنی غیبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔ بھلا کون ایسا ہوگا جو اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے بچنے کا حکم دیا ہے اور اس سے نفرت دلائی ہے، ارشادِ باری ہے:

''تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن آئے گی۔'' (الحجرات: ۱۲)

معراج کے سفر کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت ودوزخ کے مشاہدہ کے ساتھ مختلف گناہگاروں کے احوال بھی دکھائے گئے، جن میں سے ایک گناہگار کے احوال پیش کرتا ہوں، تاکہ اس گناہ (غیبت) سے ہم خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی ترغیب دیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

''جس رات مجھے معراج کرائی گئی، میں ایسے لوگوں پر گزرا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور سینوں کو چھیل رہے تھے۔ میں نے جبرئیل (علیہ السلام) سے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے گوشت کھاتے ہیں (یعنی

ان کی غیبت کرتے ہیں) اوران کی بے آبروئی کرنے میں پڑے رہتے ہیں۔'' (ابوداود)

﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ﴾ جو ناحق طریقہ سے مال حاصل کرکے گن گن کر رکھتا ہو۔ دیگر آیاتِ قرآنیہ واحادیثِ نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً مال کا جمع کرنا گناہ نہیں ہے، بلکہ مال اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے، جس کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن شریعتِ اسلامیہ نے ہر شخص کو مکلّف بنایا ہے کہ وہ صرف جائز وحلال طریقہ سے ہی مال کمائے، کیونکہ کل قیامت کے دن ہر شخص کو مال کے متعلق اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہوگا کہ کہاں سے کمایا یعنی وسائل کیا تھے؟ اور کہاں خرچ کیا؟ یعنی مال سے متعلق حقوق العباد یا حقوق اللہ میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟ غرض یہ کہ حصولِ مال کے لیے کوشش اور جستجو کرنا، نیز مستقبل کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مال جمع کرنا مذموم نہیں ہے، اگر مال کو جائز وسائل سے حاصل کیا جارہا ہے اور حقوق کی ادائیگی مکمل کی جارہی ہے۔

﴿یَحْسَبُ أَنَّ مَالَہٗ أَخْلَدَہٗ﴾ مال کی محبت میں وہ اس طرح منہمک ہوگیا کہ وہ آخرت کو بھول گیا، اور اس کے اعمال سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا، حالانکہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے، سوائے اللہ کی ذات کے۔ حکومت اللہ ہی کی ہے، اور اُسی کی طرف ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ انسان جہاں بھی ہوگا، ایک نہ ایک دن موت اُسے جا پکڑے گی، چاہے وہ مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ رہ رہا ہو۔ ہر شخص کا مرنا یقینی ہے، لیکن موت کا وقت اور جگہ سوائے اللہ کی ذات کے کسی بشر کو معلوم نہیں، چنانچہ بعض بچپن میں، تو بعض عنفوانِ شباب میں اور بعض اُدھیڑ عمر میں، جبکہ باقی بڑھاپے میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ جاتے ہیں۔ بعض صحت مند تندرست نوجوان سواری پر سوار ہوتے ہیں، لیکن اُنہیں نہیں معلوم کہ وہ موت کی سواری پر سوار ہوچکے ہیں، لہٰذا ہمیں توبہ کرکے نیک اعمال کی طرف سبقت کرنی چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''پانچ اُمور سے قبل پانچ اُمور سے فائدہ اُٹھایا جائے: بڑھاپا آنے سے قبل جوانی سے، مرنے سے قبل زندگی سے، کام آنے سے قبل خالی وقت سے، غربت آنے سے قبل مال سے، بیماری سے قبل صحت سے۔''

﴿کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِیْ الْحُطَمَۃِ﴾ ہرگز نہیں! اُس کو تو ایسی جگہ میں پھینکا جائے گا جو چورا چورا کرنے والی ہے۔ ''اَلْحُطَمَۃ'' یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی چورا چورا کردینے والی۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ سوال اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لیے ہے کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ اس پوری کائنات کے پیدا کرنے والے کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔

جہنم کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

’’اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔‘‘ (التحریم:۶)

اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

’’نہ تو اُن کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مر ہی جائیں، اور نہ اُن سے جہنم کا عذاب ہلکا کیا جائے گا۔‘‘ (الفاطر:۳۶)

یعنی جہنم میں نہ موت آئے گی اور نہ ہی عذاب کم کیا جائے گا۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں مذکور ہے کہ جہنمیوں کی غذا کھولتا ہوا پانی، کانٹوں والا کھانا، گلے میں اَٹکنے والا کھانا، زخموں کے دھوون اور پیپ، پگھلا ہوا تانبا وغیرہ ہیں، یعنی انتہائی تکلیف دہ چیزیں ہی جہنمیوں کو کھانے اور پینے کے لیے دی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

’’جب ایک دفعہ اُن کی کھال جل چکی ہوگی تو ہم اُس کی جگہ دوسری نئی کھال پیدا کردیں گے، تاکہ عذاب چکھتے ہی رہیں۔‘‘ (النساء:۵۶)

اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

’’دوزخیوں کو مارنے کے لیے لوہے کے گُرز (ایک قسم کا ہتھیار) ہیں، وہ لوگ جب بھی جہنم کی گھٹن سے نکلنا چاہیں گے، پھر اُسی میں دھکیل دئے جائیں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ جلنے کا عذاب چکھتے رہو۔‘‘ (الحج:۲۱،۲۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’جہنم کو ایک ہزار سال تک دھونکا گیا تو اُس کی آگ سرخ ہوگئی، پھر ایک ہزار سال تک دھونکا گیا تو اُس کی آگ سفید ہوگئی، پھر ایک ہزار سال تک دھونکا گیا تو اُس کی آگ سیاہ ہوگئی، چنانچہ جہنم اب سیاہ اندھیرے والی ہے۔‘‘ (ترمذی، ابن ماجہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’جہنمیوں میں سب سے ہلکا عذاب اُس شخص پر ہوگا جس کی دونوں جوتیاں اور تسمے آگ کے ہوں گے، جن کی وجہ سے ہانڈی کی طرح اُس کا دماغ کھولتا ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ مجھے ہی سب سے زیادہ عذاب ہورہا ہے، حالانکہ اُس کو سب سے کم عذاب ہوگا۔‘‘ (بخاری و مسلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’تمہاری یہ آگ (جس کو تم جلاتے ہو) دوزخ کی عذاب کا سترواں حصہ ہے۔ صحابہؓ نے

عرض کیا کہ: جلانے کو تو یہی بہت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! اس کے باوجود دنیا کی آگ سے جہنم کی آگ جلانے میں ۶۹ ر درجہ بڑھی ہوئی ہے۔'' (بخاری ومسلم)

جہنم ایسا موضوع ہے کہ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ میں نے صرف چند باتیں قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریر کی ہیں۔ انتہائی تکلیفوں کی جگہ جہنم سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنی دنیاوی زندگی اللہ کے احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق گزارنے کی کوشش کریں، جیسا کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

﴿الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ﴾ ان مذکورہ گناہوں کے مرتکبین کو ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جو دلوں تک جا چڑھے گی۔ ویسے تو آگ کی خاصیت یہی ہے کہ وہ انسان کے اعضاء کو جلا دیتی ہے، لیکن اس آگ کا خاص مزاج یہ ہوگا کہ وہ پہلے اُن دلوں کو پکڑے گی جو مال کی محبت میں آخرت کو بھول گئے تھے۔ انسان کے ذریعہ بنائی گئی نئی ٹیکنالوجی کی مدد سے بعض آلات سے مخصوص کام لیے جاتے ہیں، خالقِ کائنات نے جہنم میں ایک ایسی خاص آگ بنائی ہے جس کا سب سے پہلا حملہ اُن دلوں پر ہوگا جن میں لوگوں کے لیے بغض وعناد اور مال کی ایسی محبت جگہ کرگئی تھی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے مانع بنی۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان فرمائی ہے کہ دنیا کی آگ جب انسان کے بدن کو لگتی ہے تو دل تک پہنچے سے قبل ہی انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے، لیکن آخرت میں موت تو آتی نہیں تو وہ دل تک پہنچے گی۔

﴿اِنَّہَا عَلَیۡہِمۡ مُّؤۡصَدَۃٌ، فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ﴾ لمبے لمبے ستونوں کا مطلب یہ ہے کہ آگ کے اتنے بڑے بڑے شعلے ہوں گے جیسے ستون ہوتے ہیں اور دوزخی اس میں بند ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے لیے جہنم سے نجات کا فیصلہ فرمائے۔ اس سورت میں ہمارے لیے درس یہ ہے کہ دیگر گناہوں کے ساتھ ہمیں تین گناہوں سے ہمیشہ بچنا چاہیے:

ا:......''ھَمْز'' ۲:......''لَمْز'' اور ۳:......''ناجائز وسائل سے مال جمع کرنا''۔

''ھَمْز'' اور ''لَمْز'' کے متعدد معانی ہیں: غیبت کرنا، عیب جوئی کرنا، طعنہ دینا، برا بھلا کہنا اور کسی شخص کی توہین کرنا وغیرہ۔ ان گناہوں کا تعلق بظاہر حقوق العباد سے ہے، لہٰذا ان گناہوں سے بالکل اجتناب کریں، اپنے کیے ہوئے گناہ پر شرمندہ ہوں، اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرکے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ متعلقہ شخص سے پہلی فرصت میں اگر معاملہ صاف کرلیا جائے تو اسی میں دونوں جہاں کی خیر وعافیت وعزت وکامیابی پوشیدہ ہے۔

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

اورنگ زیب عالمگیرؒ، تاریخ کا مظلوم حکمراں

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

عجب بات ہے کہ دہلی میں چند کلومیٹر پر مشتمل ایک چھوٹی سی سڑک اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے عظیم فرماں روا کے نام منسوب ہے، لیکن یہ نسبت بھی فرقہ پرستوں کے دلوں میں کانٹا بن کر چبھ رہی ہے اوراس کا نام بدلنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اورنگ زیبؒ کے بارے میں ''جدوناتھ سرکار'' جیسے تنگ نظر، متعصب فرقہ پرست اور حقیقت بےزار مصنف کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

''اورنگ زیب کے اقتدار نے مغل حکومت کے ہلال کو بدرِ کامل بنادیا۔''

اب اگر کوئی چاند پر تھوکنے کی کوشش کرے تو یہ تھوک اسی کی طرف واپس آئے گا، اس لیے ایسی باتوں سے صرفِ نظر کرجانا نامناسب نہ ہوتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کی نئی تاریخ لکھی جارہی ہے، بلکہ نئی تاریخ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ فرقہ پرست عناصر کو مسئلہ کی اصل حقیقت بتائی جائے اور سچائی کی روشنی پھیلائی جائے۔

برصغیر پر جن مسلم خاندانوں نے حکومت کی ہے، ان میں غالباً سب سے طویل عرصہ مغلوں کے حصہ میں آیا ہے، جو ۱۵۲۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء یعنی تقریباً ساڑھے تین سو سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران اگرچہ ہمیشہ پورے خطہ پر مغلوں کو دورِ اقتدار حاصل نہیں رہا اور بہت سے علاقے ان کے قبضہ میں آتے اور جاتے رہے، لیکن تقریباً اس پورے عرصہ میں وہ قوتِ اقتدار کی علامت بنے رہے۔ اس خاندان کے چھٹے فرماں روا اورنگ زیب عالمگیرؒ تھے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ ۱۶۱۸ء میں ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے اور ۱۷۰۷ء میں وفات پائی، گویا پورے نوے سال کی طویل عمر پائی، پھر ان کی خوش قسمتی ہے کہ ۱۶۵۷ء سے لے کر ۱۷۰۷ء تک یعنی تقریباً پچاس سال انہوں نے حکومت کی اور ان کے عہد میں ہندوستان کا رقبہ جتنا وسیع ہوا، اتنا وسیع نہ اس سے پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد، یعنی موجودہ افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش

کی آخری سرحدوں اور لداخ وتبت سے لے کر جنوب میں کیرالہ تک وسیع وعریض سلطنت کا قیام اسی بادشاہ کی دَین ہے۔

ان کی اخلاقی خوبیوں پر تمام موٴرخین یہاں تک کہ ان کے مخالفین بھی متفق ہیں کہ یہ تخت شاہی پر بیٹھنے والا ایک درویش تھا، جو قرآن مجید کی کتابت اور ٹوپیوں کی سلائی سے اپنی ضروریات پوری کرتا تھا، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی موت کے وقت وصیت کی کہ ان کی اسی آمدنی سے تجہیز وتکفین کی جائے۔ ایسے زاہد، درویش صفت، قناعت پسند اور عیش وعشرت سے دور بادشاہ کی نہ صرف ہندوستان بلکہ تاریخِ عالم میں کم مثالیں مل پائیں گی۔ یہ تو ان کی ذاتی زندگی کے اوصاف ہیں۔اس کے علاوہ اورنگ زیبؒ نے اپنے عہد میں غیر معمولی اصلاحات بھی کیں: ترقیاتی کام کیے، نامنصفانہ احکام کو ختم کیا، اور سرکاری خزانوں کو عوام پر خرچ کرنے اور رفاہی کاموں کو انجام دینے کی تدبیر کی، اس سلسلہ میں چند نکات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱:......اب تک عوام پر بہت سارے ٹیکس لگائے جاتے تھے، اور یہ صرف مغل حکمرانوں کا ہی طریقہ نہیں تھا، بلکہ اس زمانہ میں جو راجے رجواڑے اور ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، وہ بھی اس طرح کے ٹیکس لیا کرتی تھیں۔شیواجی تو اپنے مقبوضہ علاقہ میں چوتھ یعنی پیداوار کا چوتھائی حصہ وصول کیا کرتے تھے۔اورنگ زیب عالمگیرؒ نے مال گزاری کے علاوہ جو ٹیکس لیے جاتے تھے،جن کی تعداد اَسّی (۸۰) ذکر کی گئی ہے، ان سب کو نامنصفانہ اور کسان مخالف قرار دیتے ہوئے ختم کردیا، حالاں کہ ان کی آمدنی کروڑوں میں ہوتی تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ عام طور پر اورنگ زیبؒ کو ہندو مخالف پیش کیا جاتا ہے، لیکن انہوں نے متعدد ایسے ٹیکسوں کو معاف کردیا، جن کا تعلق ہندوؤں سے تھا، جیسے گنگا پوجا ٹیکس، گنگا اشنان ٹیکس اور گنگا میں مردوں کو بہانے کا ٹیکس۔

۲:......انہوں نے مال گزاری کا قانون مرتب کیا اور اس کے نظم ونسق کو پختہ بنایا، یہاں تک کہ شاہ جہاں کے دور میں ڈھائی کروڑ پونڈ کے قریب سلطنت کی آمدنی تھی، تو وہ عالمگیرؒ کے دور میں چار کروڑ پونڈ کے قریب پہنچ گئی۔

۳:......حکومتوں میں یہ رواج تھا کہ جب کسی عہدہ دار کا انتقال ہوجاتا تو اس کی ساری جائیداد ضبط کرلی جاتی اور حکومت کے خزانہ میں داخل ہوجاتی، آج بھی بعض مغربی ملکوں میں ایسا قانون موجود ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کے بغیر دنیا سے گزر جائے تو اس کا پورا ترکہ حکومت کی تحویل میں چلا جاتا ہے، عالمگیرؒ نے اس طریقہ کو ختم کیا، تاکہ عہدہ دار کے وارثوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

۴:......انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مظلوموں کے لیے انصاف کا حصول آسان

ہو جائے، وہ روزانہ دو تین بار دربارِ عام کرتے تھے، یہاں حاضری میں کسی کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی، ہر چھوٹا بڑا، غریب و امیر، مسلمان و غیر مسلم، بے تکلف اپنی فریاد پیش کرسکتا تھا اور بلا تاخیر اس کو انصاف فراہم کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے لوگوں، شہزادوں اور مقرب عہدہ داروں کے خلاف فیصلہ کرنے میں بھی کسی تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ انہوں نے دور دراز کے لوگوں کے لیے۱۰۸۲ھ میں ایک فرمان کے ذریعہ ہر ضلع میں سرکاری نمائندے مقرر کیے کہ اگر لوگوں کو بادشاہ اور حکومت کے خلاف کوئی دعویٰ کرنا ہو تو وہ ان کے سامنے پیش کریں اور ان کی تحقیق کے بعد عوام کے حقوق ادا کردیں۔

۵:...... عالمگیرؒ کا ایک بڑا کارنامہ حکومت کی باخبری کے لیے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کا نظام تھا، جس کے ذریعہ ملک کے کونے کونے سے بادشاہ کے پاس اطلاعات آتی رہتی تھیں، اور حکومت تمام حالات سے باخبر رہ کر مناسب قدم اُٹھاتی تھی۔ اس نظام کے ذریعہ ملک کا تحفظ بھی ہوتا تھا، عوام کو بروقت مدد بھی پہنچائی جاتی تھی، اور عہدہ داروں کو ان کی غلطیوں پر سرزنش بھی کی جاتی تھی، اس کا سب سے بڑا فائدہ رشوت ستانی کے سدباب کی شکل میں سامنے آیا۔

عام طور پر حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو رشوت ''گفٹ'' کے نام پر دی جاتی ہے، یہ نام کرپشن کے لیے ایک پردہ کا کام کرتا تھا، اُس زمانہ میں یہ رقم نذرانہ کے نام سے دی جاتی تھی، جو بادشاہوں کو حکومت کے عہدہ داران اور اصحابِ ثروت کی جانب سے اور عہدہ داروں کو ان کے زیر اثر رعایا کی جانب سے ملا کرتی تھی۔ اورنگ زیبؒ نے ہر طرح کے نذرانہ پر پابندی لگادی، خاص کر نوروز کے جشن پر تمام امراء بادشاہ کی خدمت میں بڑے بڑے نذرانے پیش کرتے تھے، اورنگ زیبؒ نے اپنی حکومت کے اکیسویں سال اس جشن ہی کو موقوف کردیا اور فرمان جاری کردیا کہ خود ان کو کسی قسم کا نذرانہ پیش نہ کیا جائے۔

۶:...... عام طور پر جہاں بھی شخصی حکومتیں رہی ہیں، وہاں عوام کو اطاعت و فرماں برداری پر قائم رکھنے کے لیے بادشاہ کے بارے میں مبالغہ آمیز تصورات کا اسیر بنایا جاتا ہے، اسی لیے تیمور لنگ کہا کرتا تھا کہ جیسے آسمان پر خدا ہے، زمین میں وہی درجہ ایک بادشاہ کا ہے، اسی لیے مغلوں کے یہاں بھی ہندوانہ طریقہ کے مطابق ایک طرح کی بادشاہ پرستی مروّج رہی ہے۔ اکبر کے یہاں تو بادشاہ کا دیدار اور سجدہ کرنا ایک عبادت تھا اور ہر دن بے شمار لوگ یہ عبادت بجالاتے تھے، جہانگیر نے سجدہ ختم کیا، لیکن زمین بوسی باقی رہی۔ عالمگیرؒ نے جھروکا درشن بالکلیہ ختم کردیا، جس میں لوگ صبح کو بطورِ عبادت بادشاہ کا دیدار کرتے تھے اور اس وقت تک کھاتے پیتے نہیں تھے، البتہ اس بات کی اجازت تھی کہ اگر

کوئی ضرورت مند آئے تو اس کی درخواست رَسّی میں باندھ کر اوپر بادشاہ کے پاس پہنچا دی جائے۔

۷:......عموماً حکمرانوں کی شاہ خرچی اور حکمرانوں کے چونچلے غریب عوام کی کمر توڑ دیتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ایسے تکلّفات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، جیسا کہ گزرا کہ شاہی نذرانوں کو بند کیا۔

دربارِ شاہی میں بادشاہوں کی تعریف کرنے والے شعراء ہوا کرتے تھے اور ان پر ایک ذمہ دار ہوا کرتا تھا، جو ''ملک الشعراء'' کہلاتا تھا، اورنگ زیبؒ نے اس شعبہ کو ختم کردیا۔ وہ اپنی شان میں کسی بڑائی اور مبالغہ آمیز شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔

بادشاہ کا دل بہلانے کے لیے دربارِ شاہی میں گانے بجانے کا خصوصی انتظام ہوتا تھا، قوال اور رقاصائیں گاکر اور ناچ کر بادشاہ کا دل خوش کرتی تھیں اور ان پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی تھیں۔ عالمگیرؒ نے اس سلسلہ کو بھی موقوف کردیا۔

بادشاہ کے لکھنے کے لیے سونے اور چاندی کی دواتیں رکھی جاتی تھیں، عالمگیرؒ نے اس کے بجائے چینی کی دواتیں رکھنے کی تلقین کی۔ انعام کی رقمیں چاندی کے بڑے طشت میں لائی جاتی تھیں، اس طشت کی رسم کو بھی اورنگ زیبؒ نے موقوف کردیا۔

عام طور پر بادشاہوں کی جیب خرچ کے لیے کروڑوں روپے کی آمدنی مخصوص کردی جاتی تھی، آج بھی جمہوری ملکوں میں سربراہِ حکومت کے لیے رہائش، سفر اور ضروریات وغیرہ پر جو رقمیں صرف کی جاتی ہیں اور رہائش کے لیے جو وسیع مکان اور اعلیٰ درجہ کی سہولت فراہم کی جاتی ہے، وہ گزشتہ بادشاہوں کی شاہ خرچی کو بھی شرمندہ کرتی ہیں، لیکن اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے لیے نہ کوئی عظیم الشان محل تعمیر کرایا، نہ اپنی تفریح کے لیے کوئی باغ بنوایا، اور اپنے مصارف کے لیے بھی محض چند گاؤں کو اپنے حصہ میں رکھا اور بقیہ سارے مصارف کو حکومت کے خزانہ میں شامل کردیا۔

۸:......انہوں نے تعلیم کی ترقی پر خصوصی توجہ دی، ہر شہر اور ہر قصبہ میں اساتذہ مقرر ہوئے، نہ صرف اساتذہ کے لیے وظائف مقرر کیے گئے اور جاگیریں دی گئیں، بلکہ طلبہ کے اخراجات اور مددِ معاش کے لیے بھی حکومت کی طرف سے سہولتیں فراہم کی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کے زیادہ تر فرامین تعلیم ہی سے متعلق ہیں، جن کو ان کے بعض تذکرہ نگاروں نے نقل بھی کیا ہے۔

۹:......اس زمانہ میں صنعت وحرفت کو آج کی طرح ترقی نہیں ہوئی تھی اور معیشت کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت تھی، اورنگ زیبؒ نے زرعی ترقی پر خصوصی توجہ دی، کسانوں کی حوصلہ افزائی کی، جن کسانوں کے پاس کاشت کاری کے لیے پیسہ نہیں ہوتا، ان کو سرکاری خزانوں سے پیسہ فراہم کیا

جاتا۔ حسبِ ضرورت کسانوں سے مال گزاری معاف کی گئی ۔ جو زمینیں اُفتادہ تھیں اور ان میں کاشت نہیں کی جاتی تھی، ان کو ایسے کسانوں کے حوالہ کیا گیا، جو اُن کو آباد کرنے کے لیے آمادہ تھے ۔ اپنے عہدہ داروں کو ہدایت کی کہ کسانوں کو اتنا ہی لگان لگایا جائے، جتنا وہ بآسانی اور بخوشی ادا کرسکیں ۔ اگر وہ نقد کے بجائے جنس دینا چاہیں تو قبول کرلیا جائے ۔ انہوں نے کسانوں کے لیے کنواں کھدوانے، قدیم کنوؤں کو درست کرانے اور آب پاشی کے وسائل کو بہتر بنانے کو حکومت کی ایک ذمہ داری قرار دیا۔ انہوں نے زمین کے سروے کرنے پر خصوصی توجہ کی، تاکہ معلوم ہو کہ کون سی اراضی اُفتادہ ہیں اور اُن کو قابل کاشت بنانے کی کیا صورت ہے؟ انہوں نے اپنے فرمان میں لکھا ہے:

> ’’بادشاہ کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہ ہے کہ زراعت ترقی کرے، اس ملک کی زرعی پیداوار بڑھے، کاشت کار خوش حال ہوں اور عام رعایا کو فراغت نصیب ہو، جو خدا کی طرف سے امانت کے طور پر ایک بادشاہ کو سونپی گئی ہے ۔‘‘

زرعی پیداوار کی طرف اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں فتح ہونے والے بہت سے علاقے ایسے تھے، جہاں کے اخراجات وہاں کی آمدنی سے زیادہ تھے، لیکن پھر بھی کہیں غذائی اشیاء کی قلت محسوس نہیں کی گئی، اگر یہ صورتِ حال نہیں ہوتی تو اتنے طویل وعریض رقبہ پر پچاس سال تک اورنگ زیبؒ حکومت نہیں کر پاتے اور وہ عوام کی بغاوت کے نتیجہ میں مملکت پارہ پارہ ہوجاتی ۔

۱۰:......اورنگ زیبؒ کا ایک بڑا کارنامہ سماجی اصلاح بھی ہے، انہوں نے بھنگ کی کاشت پر پابندی لگائی ۔ شراب وجوئے کی ممانعت کردی ۔ قحبہ گری کو روکا اور فاحشہ عورتوں کو شادی کرنے پر مجبور کیا۔ لونڈی، غلام بنا کر رکھنے یا خواجہ سرا رکھنے پر پابندی لگائی ۔

۱۱:...... ہندو سماج میں عرصۂ دراز سے ستی کا طریقہ مروّج تھا، جس کے تحت شوہر کے مرنے کے بعد بیوی شوہر کی چتا کے ساتھ نذرِ آتش کردی جاتی تھی، ہندو سماج میں اُسے مذہبی عمل سمجھا جاتا تھا۔ مغلوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے، اس لیے اورنگ زیبؒ نے قانونی طور پر اس کو بالکلیہ تو منع نہ کیا، لیکن اصلاح اور ذہن سازی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے عہدہ داروں کو ہدایت دی کہ وہ عورتوں کو اس رسم سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور اپنی خواتین کے ذریعہ بھی ان کو اس کی دعوت دیں ۔ نیز پابندی عائد کردی کہ علاقہ کے صوبہ دار کی اجازت کے بغیر ستی نہ کی جائے، تاکہ کسی عورت کو اس عمل پر اس کے میکہ یا سسرال والے یا سوسائٹی کے دوسرے لوگ مجبور نہ کرسکیں، اس طرح عملاً ستی کا رواج تقریباً ختم ہوگیا۔

غرض کہ اورنگ زیبؒ نے قدیم سڑکوں اور سرایوں کی مرمت، نئی سڑکوں اور مسافر خانوں کی

تعمیر، تعلیمی اداروں اور عبادت گاہوں کو جاگیروں کے عطیہ وغیرہ کے جو رفاہی کام کیے، ان کے علاوہ مختلف دوسرے میدانوں میں جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ بھی آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ ان کی رحم دلی، انصاف پروری اور عفو و درگزر کا ان لوگوں نے بھی اعتراف کیا ہے، جو اُن کو ایک خشک مزاج، ناروادار اور سخت گیر حکمراں قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے حریفوں کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سنی ہوں یا شیعہ، پٹھان ہوں یا مراٹھے و راجپوت، زیادہ سے زیادہ صلح اور درگزر کی پالیسی اختیار کی، خود شیواجی کو جس طرح انہوں نے بار بار معاف کیا اور اس کے بیٹے کو گلے لگایا، یہ اس کی بہترین مثال ہے۔ مگر افسوس کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار قائم کرنے کی جو منصوبہ بند کوشش کی، اس میں مغلوں کے دورِ حکومت کو عموماً اور آخری پُر شوکت مغل بادشاہ اورنگ زیبؒ (جس کو انگریز اپنے راستہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے) کے بارے میں خصوصاً بڑی غلط فہمیاں پھیلائیں اور بعض مصنفین نے ان کا آلہ کار بنتے ہوئے ایسی کتابیں تصنیف کیں، جن کو تاریخ اور واقعہ نگاری کے بجائے ناول نگاری اور افسانہ نویسی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، انہوں نے ایسی بے بنیاد باتیں لکھ دیں جن کا حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اورنگ زیبؒ کو ایک ہندو دشمن حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور اس کے لیے اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ کو بنیاد بنایا گیا، حالاں کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی نہ کہ مذہبی۔ اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ میں اورنگ زیبؒ کا سب سے معتمد کمانڈر ایک راجپوت راجہ جے سنگھ تھا، اور بے شمار راجپوت اور مراٹھے سردار اورنگ زیبؒ کے ساتھ تھے اور ان کی فوج میں بھی بڑی تعداد پٹھانوں، راجپوتوں اور شیواجی کے مخالف مراٹھوں کی تھی۔

اورنگ زیبؒ کے عہد میں جو غیر مسلم حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہے ہیں، ان میں کئی مرہٹے ہیں، جن میں شیواجی کے داماد اور بھتیجے بھی شامل ہیں۔ علامہ شبلیؒ نے ان کا نام بہ نام ذکر کیا ہے، جن کی تعداد ۲۶ ہے، خود شیواجی کو بھی اورنگ زیبؒ نے پنج ہزاری منصب عطا کیا تھا، جو بڑا منصب تھا، اور جس پر بادشاہ کے بعض شہزادے، قریبی رشتہ دار اور معتمد عہدہ دار فائز تھے، البتہ شیواجی ہفت ہزاری چاہتے تھے، مگر راجپوت اور پٹھان اعیانِ حکومت اس کے حق میں نہیں تھے۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ شیواجی جو مغلوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑا کرتے تھے، وہ گاؤں کے گاؤں لوٹ لیا کرتے تھے، قلعوں کو تاخت و تاراج کر دیا کرتے تھے، یہ لوٹ مار ان کی مستقل حکمت عملی تھی، اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں ہوا کرتی تھی۔ سورت اس زمانہ میں جنوبی ہند کی سب سے بڑی منڈی تھی، جو بیرونی ممالک سے درآمد و برآمد کا بہت بڑا ذریعہ تھا، یہاں غالب

آبادی ہندوؤں کی تھی، شیواجی موقع بموقع وہاں ایسا حملہ کرتے تھے کہ پورا شہر ویران ہوجاتا تھا، کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا ملکی اور کیا غیر ملکی؟ سب کے سب ان حملوں سے پناہ چاہتے تھے، ان حملوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی تفریق نہیں تھی، بلکہ تاجروں کی غالب تعداد ہندوؤں کی تھی، اس لیے ان کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ شیواجی جن کو مراٹھوں کا نجات دہندہ سمجھا جاتا ہے، خود مراٹھوں کے خلاف بھی انہوں نے وہی کیا، جو ہر بادشاہ اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کیا کرتا ہے۔ بیجاپور کے پہلے سلطان نے ایک مراٹھے خاندان کو ''جاولی'' کا علاقہ عطا کیا، جس نے ایک مضبوط ریاست بنائی اور یہ بتدریج کوکن کے پورے علاقہ پر قابض ہوگیا، اس خاندان کے راجا کا خاندانی لقب چندرراؤ تھا۔ شیواجی کا احساس تھا کہ جب تک چندرراؤ کا قتل نہ کیا جائے اور اس کی سلطنت پر قبضہ نہ ہوجائے، شیواجی جس وسیع سلطنت کا منصوبہ رکھتے ہیں' وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، اس لیے اس نے دھوکہ دے کر اس مرہٹہ راجا کو قتل کیا، اس کے بھائی کو زخمی کیا اور اس کی سلطنت پر قابض ہوگئے۔ غرض کہ اورنگ زیبؒ اور شیواجی کی جنگ کوئی مذہبی جنگ نہیں تھی، بلکہ ایک سیاسی جنگ تھی، جو حکمرانوں کے درمیان ہمیشہ ہوتی رہی ہے، نہ اورنگ زیبؒ نے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جنگ لڑی ہے اور نہ شیواجی کا حملہ ہندوؤں کے وقار کی حفاظت کے لیے ہوا ہے۔

اورنگ زیبؒ پر ایک الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا ہے اور مندر شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اورنگ زیبؒ کے عہد میں بعض مندر منہدم کیے گئے ہیں، لیکن اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس کا سبب کیا تھا؟ غیر جانب دار مؤرخین نے لکھا ہے کہ اورنگ زیبؒ نے انہیں مندروں کو منہدم کیا تھا، جو غیر قانونی طور پر بنائے گئے تھے، مثلاً اورچھا میں ببر سنگھ دیو کے بنائے ہوئے ایک مندر کو اورنگ زیبؒ نے منہدم کرادیا، لیکن اس لیے کہ ببر سنگھ دیو نے اولاً تو ظالمانہ طور پر ابوالفضل کو قتل کیا اور پھر اسی کے سرمایہ سے وہ مندر بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مندر منہدم کیا گیا تو وہاں کے راجہ دیوی سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یا اس نے ایسے مندروں کو گرایا، جہاں حکومتوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں، یا ایسے مندروں کو جہاں غیر اخلاقی حرکتیں کی جاتی تھیں، جیسے بنارس کا وشوناتھ مندر، ڈاکٹر بی، ایم، پانڈے نے اس کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے کہ اورنگ زیبؒ جب بنگال جاتے ہوئے بنارس کے قریب سے گزرے تو اس کی فوج میں شامل ہندو راجاؤں اور کمانڈروں نے وہاں ایک دن قیام کی درخواست کی، تاکہ ان کی رانیاں گنگا اشنان کرسکیں اور وشوناتھ دیوتا کی پوجا کریں۔ اورنگ زیبؒ راضی ہوگئے، انہوں نے فوج کے ذریعہ حفاظت کا پورا انتظام کیا، رانیاں اشنان سے فارغ ہوکر وشوناتھ مندر روانہ ہوئیں، لیکن جب مندروں

سے رانیاں واپس ہوئیں تو اس میں بعض موجود نہیں تھیں، کافی تلاش کی گئی، مگر پتہ نہیں چل سکا، بالآخر تحقیق کاروں نے دیوار میں نصب گنیش کی مورتی کو ہلایا، جو اپنی جگہ سے ہلائی جاسکتی تھی تو نیچے سیڑھیاں نظر آئیں، یہ سیڑھیاں ایک تہہ خانہ کی طرف جاتی تھیں، وہاں انہوں نے دیکھا کہ بعض رانیوں کی عصمت ریزی کی جاچکی ہے اور وہ زار وقطار رورہی ہیں، چناں چہ اورنگ زیبؒ کی فوج میں شامل راجپوت کمانڈروں نے اس مندر کو منہدم کردینے کا مطالبہ کیا۔ اورنگ زیبؒ نے حکم دیا کہ مورتی کو پورے احترام کے ساتھ دوسری جگہ منتقل کردیا جائے اور چوں کہ ایک مقدس مذہبی مقام کو ناپاک کیا گیا ہے، اس لیے اس کو منہدم کردیا جائے اور مہنت کو گرفتار کرکے سزادی جائے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اکبر کے دور سے صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سی مسجدوں کو منہدم کرکے بت خانے بنادیئے جاتے تھے، ہندو مسلمان عورتوں سے جبراً نکاح کرتے تھے اور انہیں اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں بھی یہی صورتِ حال باقی رہی اور خود اورنگ زیبؒ کی حکومت کے بارہویں سال تک یہی صورتِ حال تھی، ممکن ہے کہ بعض مندروں کے انہدام کا یہی پس منظر ہو۔ چناں چہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اورنگ زیبؒ نے جہاں مندر منہدم کیے ہیں، وہیں مسجد بھی منہدم کروائی ہے، کہا جاتا ہے کہ سلطنت گولکنڈہ کے مشہور فرماں روا تانا شاہ نے سال ہا سال سے شہنشاہِ دہلی کو شاہی محصول ادا نہیں کیا تھا، اس نے اپنی دولت کو چھپانے کے لیے ایک بڑا خزانہ زیر زمین دفن کرکے اس پر جامع مسجد گولکنڈہ تعمیر کرادی، اورنگ زیبؒ کو کسی طرح اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس مسجد کو منہدم کرادیا، اور اس خزانہ کو رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کردیا۔

افسوس کہ فرقہ پرست، متعصب اور دروغ گو تذکرہ نگاروں نے اورنگ زیبؒ کی اس سخاوت اور وسیع النظری کا تذکرہ نہیں کیا، جو ان کا اصل مزاج تھا۔

کاش! فرقہ پرست عناصر کبھی اس بات پر بھی غور کرتے کہ خود ہندوؤں نے کس طرح بودھوں کی خانقاہوں، جینیوں کے مندروں اور مسلمانوں کی مسجدوں کو منہدم کیا ہے۔ خود شیواجی نے ستارہ، پارلی، اور زیر قبضہ آنے والے علاقوں میں مسجدوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ایلورا اور اجنتا میں بودھوں کو یہ کیوں کرنا پڑا کہ اپنی عظیم الشان خانقاہوں کو مٹی سے ڈھانپ دیں، تاکہ وہ ہندوؤں کی دست برد سے محفوظ رہ سکیں۔ آج بھی جگن ناتھ مندر ہندوؤں کی زیادتی کی گواہ بن کر کھڑا ہے، جو دراصل بودھوں کا مندر تھا، اور جس پر زبردستی ہندوؤں نے قبضہ کرلیا۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں ہزاروں مسجدیں شہید کردی گئیں، اندرا گاندھی کے دور میں سکھوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ گولڈن ٹمپل اور اکال تخت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ گجرات کے ۲۰۰۲ء کے فساد میں کتنی ہی مسجدیں شہید

کر دی گئیں اور حکومت نے اس کی تعمیر نو کرنے سے انکار کر دیا۔ کیا فرقہ پرست عناصر سچائی کی نشان دہی کرنے والے اس آئینہ میں بھی اپنا چہرہ دیکھنا گوارہ کریں گے؟

اورنگ زیبؒ کے فردِ جرم میں اس بات کو بھی شامل کیا گیا ہے کہ انہوں نے ہندوؤں پر جزیہ لگا دیا تھا، لیکن اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اَسّی (۸۰) قسم کے ٹیکس معاف کر دیئے، جن میں کئی ٹیکسوں کا تعلق ہندوؤں سے تھا اور جزیہ اُن پر اس لیے عائد کیا گیا کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لی جاتی تھی، اگر ہندوؤں سے بھی زکوٰۃ لی جاتی تو یہ ان کو ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنا ہوتا، اور مذہبی آزادی کے تقاضے کے خلاف ہوتا، اس لیے اسلام نے غیر مسلم شہریوں پر الگ نام سے یہ ٹیکس مقرر کیا ہے اور اس کی مقدار نہایت قلیل ہے: فی کس بارہ درہم یعنی ۱۳؍تولہ چاندی سے بھی کم، پھر شریعت کے حکم کے مطابق اورنگ زیبؒ نے عورتوں، بچوں، مذہبی پیشواؤں، معذوروں اور غریبوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا اور جزیہ کے بدلہ غیر مسلم عوام کے تحفظ کی گارنٹی دی گئی۔

ان سب کے باوجود ہمیں یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اورنگ زیبؒ کوئی عالم، مفتی اور صوفی نہ تھے، بلکہ ایک سیاسی قائد اور حکمراں تھے، بھائیوں کا قتل ہو یا بعض سکھ رہنماؤں کا، مندروں کا انہدام ہو یا مسجدوں کا، یہ سیاسی مقاصد کے تحت تھے، یہ غلط ہو سکتے ہیں، لیکن اس کو مذہب کی جنگ قرار دینا اس سے زیادہ غلط ہے۔ اورنگ زیب سے متعلق جو الزامات ہیں، وہ علم وتحقیق کے بجائے غلط فہمی اور جذبات پر مبنی ہیں، جو لوگ اس معاملہ کی سچائی کو جاننا چاہیں اور غیر جانب دارانہ مطالعہ کرنا چاہیں، انہیں علامہ شبلی نعمانیؒ کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ پر ایک نظر''، سیّد صباح الدین عبد الرحمٰنؒ کی ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' (جلد سوم)، مولوی ذکاء اللہ کی ''اورنگ زیب عالمگیرؒ'' اور مولانا نجیب اشرف ندوی کی ''مقدمہ رقعات عالمگیر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس وقت ایک بڑا کام یہ ہے کہ کچھ حقیقت پسند، غیر جانب دار لکھنے والے اُٹھیں اور سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی تک کی تاریخ اس طور پر لکھیں، جو فرقہ وارانہ تأثرات سے خالی ہو، جس میں ہر طبقہ کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، جس میں بادشاہوں اور راجاؤں کی جنگ کو ایک سیاسی جنگ کی نظر سے دیکھا جائے نہ کہ مذہبی جنگ کی حیثیت سے، جس میں مسلمانوں کے درمیان باہمی رواداری اور اخوت و بھائی چارہ کو نمایاں کیا جائے، جو محبت کی خوش بو بکھیرے نہ کہ نفرت کا تعفن۔

یہ ایک ضروری کام ہے، جس کی طرف تحقیقاتی اکیڈمیوں، تعلیمی اداروں، ملّی تنظیموں، قومی اداروں اور باصلاحیت اور منصف مزاج دانش وروں کو توجہ دینی چاہیے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

’’شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا‘‘ اور اُن کا حکم

مولانا انعام اللہ

(پہلی قسط)

تمہید وتعارف

تمہید میں تعارف کے طور پر ’’شرائع من قبلنا‘‘ کا ایک عمومی مفہوم ذیل کی سطور میں ملاحظہ ہو:

’’شرائع من قبلنا‘‘ کا معنی ہے: ہم (اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے پہلے کی شریعتیں، یعنی آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تشریف لانے والے انبیاء کرام علیہم السلام کی وہ آسمانی شریعتیں، جو وہ اپنی اُمتوں کے پاس لے کر آئے تھے، اور جن کا ذکر ان کی کتابوں (توراۃ اور انجیل وغیرہ) میں موجود ہے۔ ان شریعتوں کے احکام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں، جن پر ایمان لانا اور ان کے مطابق عمل کرنا ان سابقہ انبیاء علیہم السلام کے زمانۂ نبوت میں ضروری تھا، تاہم شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آنے کے بعد وہ تمام گزشتہ شریعتیں منسوخ ہوگئی ہیں۔

تو کیا وہ شریعتیں من کل الوجوہ منسوخ ہوگئیں؟ یا فی الجملہ؟ اگر فی الجملہ منسوخ ہیں، یعنی ان کے کچھ احکام اب بھی برقرار ہیں، تو کس حیثیت سے؟ مثلاً: شریعتِ موسویہ کی حیثیت سے؟ یا پھر شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت سے؟ نیز جو کل یا بعض احکام منسوخ ہیں، تو ان کے نسخ کا وقت کب سے شروع ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے؟ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد؟ اس طرح کے تمام سوالات کے جوابات پر مشتمل ایک تحقیقی جائزہ تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول فقہ اور کلام کی کتابوں سے یہاں نقل کیا گیا ہے۔

ان مباحث کو بیان کرنے سے قبل چند اصطلاحات کی وضاحت ضروری ہے، جو لفظِ شریعت کے ہم معنی یا قریب المعنی کے طور پر استعمال ہوتی رہتی ہیں، مثلاً: دین، ملت اور مذہب وغیرہ۔

مقدمہ: - دین، ملة اور شريعة - معنی اور تعریف

لفظِ ’’دین‘‘ کا لغوی معنی

لفظِ ’’دین‘‘ کا لغوی معنی طاعت اور انقیاد ہے، اور اس لفظ کے تمام مشتقات میں یہی معنی

پایا جاتا ہے، ابن فارسؒ لکھتے ہیں:

''دِین'' ایک ہی اصل ہے جس کی طرف اس طرح کے تمام فروع لوٹتے ہیں، فرماں برداری اور کمزور ہونے کی ایک صورت ہے۔ پس دین کا معنی ہے: اطاعت گزاری۔ کہا جاتا ہے: ''دَانَ لَهُ يَدِيْنُ دِيْنًا'' تابعدار، فرماں بردار اور اطاعت گزار ہوگیا۔ ''قَوْمٌ دِيْنٌ'' کا معنی ہے: فرماں بردار لوگ۔ ''الْمَدِينَةُ'' بروزن ''مَفْعَلَة'' بمعنی شہر کو اس لیے مدینہ کہا جاتا ہے کہ وہاں حکمرانوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس معنی کر ''مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ'' کہا گیا، یعنی فیصلے والا دن۔ بعض کے نزدیک حساب کتاب اور بدلے والا دن۔ کوئی بھی معنی ہو، وہ دن ایسا ہوگا جس میں سر جھکانا ہوگا۔ اس قبیل سے ''الدَّيْنُ'' (قرضہ) ہے، اس لیے کہ قرض میں مکمل رسوائی، پستی اور تابعداری ہوتی ہے۔ عرب کہتے ہیں: ''الدَّيْنُ ذُلٌّ بِالنَّهَارِ، وَغَمٌّ بِاللَّيْلِ'' (قرضہ دن کے وقت رسوائی کا باعث ہے اور رات کو پریشانی کا باعث ہے)۔''(۱)

لفظِ ''ملّة'' کا لغوی معنی

لفظ ''ملّة'' کا لغوی معنی: اُکتا جانا، گرم ریت پر چلنا، کہنا، لکھوانا اور ملت اختیار کرنا ہے، علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

''(م،ل،ل: اس مادے سے مشتق الفاظ کا معنی ہے اُکتا جانا، کہا جاتا ہے: ''أطعمهٔ خبزَ ملّة'' اس کو ''ملة'' (گرم ریت والی روٹی) کھلائی۔ ''طریق ممل'' وہ راستہ جس پر لوگوں کی بہت زیادہ چلن ہو۔ مِلَّةٌ: بمعنی چلنے کا راستہ، اس سے لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: ''ملتِ ابراہیمی بہترین ملت ہے۔'' ''امتلَّ'' کا معنی ہے: ملت اختیار کرنا۔''(۲)

ابن سیدہؒ لکھتے ہیں:

''طَرِيقٌ مَلِيلٌ'' اور ''مُمِلٌّ'' وہ راستہ جس پر اس حد تک چلاؤ ہو کہ راستے کے نشان پڑ جائیں۔ ''أَمَلَّ الشَّيءَ'' کا معنی ہے: کہہ دیا اور لکھوایا۔ ''ملة'' کا معنی ہے: شریعت۔ ''تَمَلَّلَ وامْتَلَّ'' کا معنی ہے: ملت میں داخل ہوا۔ جلدی کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔''(۳)

لفظِ ''شریعة'' کا لغوی معنی

لفظ ''شریعة'' کا لغوی معنی پانی کی گھاٹ اور راستہ ہے، صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:

''شَرَعَ الْوَارِدُ'' کا معنی ہے: براہِ راست منہ لگا کر پانی پی لیا، اور ''شَرَعَتِ الدَّوَابُّ فِيْ الْمَاءِ'' کا معنی ہے: چوپائے پانی میں داخل ہوگئے۔ ''شَرِيْعَةٌ، شِرَاعٌ'' اور ''مَشْرَعَةٌ'' پانی کی اس گھاٹ اور راستہ کو کہا جاتا ہے، جہاں سے پانی پینے کے لیے اُترا جاتا ہے۔

لیثؒ کہتے ہیں: اسی معنی کی مناسبت سے ان احکام کا نام شریعت رکھا گیا ہے، جن کو اللہ نے روزہ، نماز، حج اور نکاح وغیرہ کی شکل میں اپنے بندوں کے لیے شریعت مقرر کردی ہے۔ کلامِ عرب میں ''الشِّرْعۃُ'' اور ''الشَّرِیْعَۃُ'' پانی کی گھاٹ کو کہا جاتا ہے، یعنی پانی پینے کی وہ جگہ اور راستہ جہاں سے لوگ پانی میں داخل ہوتے ہیں، اور پانی پیتے ہیں۔ عرب اس گھاٹ کو اس وقت تک شریعت نہیں کہتے، جب تک وہ تیار اور غیر منقطع نہ ہو، نظر آنے والا اور جاری ہو، ڈول کے ذریعے اس سے پانی حاصل نہ کیا جاتا ہو۔'' (۴)

اصطلاحی تعریفات

لفظ ''دین''، ''ملة'' اور ''شريعة'' کی چند اصطلاحی تعریفات ملاحظہ ہوں:

''الدین'' کی اصطلاحی تعریف

پہلی تعریف

''الـديـن: ما يذهب إليه الإنسان ويعتقد أنه يقربهٗ إلى الله وإن لم يكن فيه شرائع مثل دين أهل الشرک۔''(۵)

''دین ان امور کا نام ہے جن کو انسان اختیار کرتا ہے، اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ اُمور مجھے قربِ الٰہی نصیب کرادیں گے، اگرچہ ان میں شریعتیں نہ ہوں، جیسے مشرکین کا دین۔''

دوسری تعریف

''الدين: وضعٌ إلٰهيٌّ يدعو أصحابَ العقول إلى قبول ما هو عند الرسولؐ۔''

''اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ وہ امور دین ہیں، جو رسول پر اتاری گئیں تعلیمات کو قبول کرنے کی طرف عقل والوں کو دعوت دیتے ہوں۔''

تیسری تعریف

''وضعٌ إلٰهيٌّ سائقٌ لذوی العقول باختيارهم المحمود إلى الخير بالذات۔''(۶)

''ان خداوندی قوانین کا نام ہے جو عقل والوں کو ان کے اچھے اختیار کے ذریعے خیر بالذات کی طرف لے جائیں۔''

''الشريعة'' کی اصطلاحی تعریف

پہلی تعریف

''اسْـمُ الشَّـرِيْـعَةِ وَالشَّـرْعِ وَالشِّـرْعَةِ فَـإِنَّـهٗ يَـنْـتَـظِمُ كُلَّ مَا شَرَعَهُ اللّٰهُ مِنَ الْعَقَائِدِ

وَالْأَعْمَالِ۔‘‘(۷)

’’الشَّرِيعَةُ وَالشَّرْعُ وَالشِّرْعَةُ‘‘ کا لفظ تمام ان عقائد اور اعمال کو شامل ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے شرعی قانون کے طور پر مقرر کیا ہو۔‘‘

دوسری تعریف

’’ماشرع اللّٰهُ لعبادهِ مِن الأحكام التى جاء بها نبى من الأنبياء صلى اللّٰه عليهم وعلٰى نبينا وسلم سواء كانت متعلقة بكيفية عمل وتسمى فرعية وعملية أو بكيفية الاعتقاد، وتسمى أصلية۔‘‘(۸)

’’بندوں کے لیے مقرر کردہ وہ احکام، جن کو انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کوئی بھی نبی لائے ہوں، شریعت کہلاتی ہے، خواہ وہ احکام عمل سے متعلق ہوں، وہ احکام فرعیہ عملیہ کہلاتے ہیں یا عقیدہ سے متعلق ہوں، وہ احکام اصلیہ کہلاتے ہیں۔‘‘

یہ مطلق شریعت کی تعریف ہے، چونکہ ہماری مراد شریعتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہے، اس لیے اس کی تعریف حسب ذیل ہوگی:

’’الشريعةالمحمدية‘‘ کی اصطلاحی تعریف

’’هى ماسنَّه اللّٰه لعباده من الأحكام عن طريق نبينا محمد صلى اللّٰه عليه وسلم وجعلهٗ خاتمة لرسالاته۔‘‘(۹)

’’شریعت محمدیہ سے مراد احکام کا وہ مجموعہ ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے اور اس کو تمام رسالتوں اور شریعتوں کے لیے خاتم قرار دیا ہو۔‘‘

’’الملة‘‘ کی اصطلاحی تعریف

’’الملة هى: الدين، غير أن الملة لا تستعمل إلا فى جملة الشرائع دون آحادها۔‘‘(۱۰)

’’ملة‘‘ دین ہی ہے، تاہم ’’ملة‘‘ کا لفظ مجموعہ شرائع میں استعمال ہوتا ہے، ایک ایک حکم میں نہیں۔‘‘

تینوں کلمات کی اصطلاحی تعریفات سے معلوم ہوا کہ ان کے مصداق میں جوہری و بنیادی فرق نہیں، بلکہ ان کے درمیان دو چیزیں قدر مشترک ہیں: پہلی یہ کہ عقائد و اعمال کا وہ مجموعہ جو الٰہی تعلیمات پر مشتمل ہو۔ دوسری یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے واسطے سے اُمت کو ملا ہو، جیسا کہ تعریف میں صراحۃً بتایا گیا کہ ملت اور دین ہم معنی ہیں، اس لیے ’’ملة‘‘ کی الگ تعریف نہیں کی گئی ہے، گویا ان کلمات کا مصداق ایک ہے، تاہم اعتباری فرق کی وجہ سے الگ الگ نام تجویز کیے گئے ہیں وہ

اعتباری فرق کیا ہے؟ اور ان کی مصداق میں باہم کیا نسبت ہے؟ ذیل کے سطور میں ملاحظہ ہو:

''دین''، ''ملة'' اور ''شریعت'' کے درمیان نسبت اور فرق

ابوالہلال العسکری کے نزدیک

ابوالہلال العسکری کے نزدیک تینوں کا مصداق ایک ہے، فرق اعتباری ہے جس میں لغوی معنی مدنظر رکھا گیا ہے، لکھتے ہیں:

''الدین: ھو الطریقة المخصوصة الثابتة من النبی صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم، یسمی من حیث الانقیاد لهٗ دینا، ومن حیث إنهٗ یملی ویبین للناس ملة، ومن حیث إنه یردھا الواردون المتعطشون إلی زلال نیل الکمال شرعاً وشریعةً۔''(۱۱)

''دین حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت مخصوص طریقے کا نام ہے۔ اس کو اس اعتبار سے ''دین'' کہا جاتا ہے کہ دل وجان سے مان کر اس کا انقیاد (سرِتسلیم خم) کیا جائے۔ اور اس حیثیت سے ''ملت'' کہلاتا ہے کہ اس کو بتایا جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے بیان کیا جاتا ہے۔ اور اس حیثیت سے ''شریعت'' کہلاتا ہے کہ مرتبۂ کمال تک پہنچنے کے میٹھے خوشگوار پانی کے پیاسے اس گھاٹ پر آکر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔''

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تینوں مصطلحات کا مصداق ایک ہے، اور ان کے درمیان نسبت اتحاد ہے، فرق اگر ہے تو اعتباری ہے، یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے اُمتوں کو ملنے والا عقائد واعمال پر مشتمل آسمانی والٰہی تعلیمات کا مجموعہ اس حیثیت سے ''شریعت'' کہلاتا ہے کہ ہدایت کے پیاسے لوگ پانی کے مشابہ وحی کی گھاٹ پر آتے ہیں، اور ہدایت حاصل کر کے پیاس بجھا لیتے ہیں۔ اور اس حیثیت سے ''دین'' کہلاتا ہے کہ لوگ اس مجموعۂ عقائد واعمال کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔ اور اس حیثیت سے ''ملت'' کہلاتا ہے کہ اس کو مربوط انداز میں جمع کر کے لوگوں کے سامنے بیان کیا جاتا ہے اور اس حیثیت سے ''مذہب'' کہلاتا ہے کہ اس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہیں، اور دینی ضرورت پورا کرنے کے لیے اس کی طرف ذہاب اختیار کرتے ہیں، گویا ہر اصطلاح میں معنی لغوی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

شریف جرجانی کا قول

شریف جرجانی نے قدرے مختلف انداز اختیار کیا ہے، ان کے ہاں مذہب کی اصطلاح بھی ان تینوں مصطلحات کے مترادف ہے اور چاروں متحد بالذات اور مختلف بالاعتبار ہیں، فرق اعتباری میں یا تو معنی لغوی ملحوظ ہے، جیسا کہ ابوالہلال العسکری کے ہاں ہیں یا پھر نسبت کے اعتبار سے فرق ہے، فرماتے ہیں:

’’الدِّین والملة متحدان بالذات، ومختلفان بالاعتبار، فإن الشريعة من حيث إنها تطاع تسمٰى دينًا، ومن حيث إنها تُجمع تسمٰى ملةً، ومن حيث إنها يُرجَع إليها تسمى مذهبًا، وقيل: الفرق بين الدين، والملة، والمذهب أن الدين منسوب إلى الله تعالٰى، والملّة منسوبة إلى الرسول، والمذهب منسوبٌ إلى المجتهد۔‘‘(۱۲)

’’دین‘‘ اور ’’ملت‘‘ متحد بالذات اور مختلف بالاعتبار ہیں، چنانچہ ’’شریعت‘‘ اس حیثیت سے ’’دین‘‘ کہلاتی ہے کہ اس کی اطاعت اور پیروی کی جاتی ہے۔ اور اس حیثیت سے ’’ملت‘‘ کہلاتی ہے کہ اس کو جمع کیا جاتا ہے اور اس حیثیت سے ’’مذہب‘‘ کہلاتی ہے کہ اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ ایک اور قول کے مطابق تینوں میں فرق یہ ہے کہ ’’دین‘‘ اللہ کی طرف، ’’ملت‘‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، اور ’’مذہب‘‘ مجتہد کی طرف منسوب ہے۔‘‘

اس توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ وحی سے مأخوذ عقائد واعمال کا مجموعہ تو اصالۃً ’’شریعت‘‘ ہے، جو باعتبار اطاعت کے ’’دین‘‘ اور باعتبار جمع وبیان کے ’’ملت‘‘ اور باعتبار رجوع الیہ ’’مذہب‘‘ کہلاتا ہے۔ گویا ’’مذہب‘‘ کو بھی ’’شریعت‘‘، ’’ملت‘‘ اور ’’دین‘‘ کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ نیز ’’شریعت‘‘ کی وجہ تسمیہ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مزید برآں! ایک اور حوالے سے بھی فرق بیان کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے اعتبار سے ’’دین‘‘، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کے اعتبار سے ’’ملت‘‘ اور مجتہد کی طرف نسبت کے اعتبار سے ’’مذہب‘‘ کہلاتا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ اصطلاحاتِ ثلٰثہ من کل الوجوہ متحد بالذات نہیں، مصداق میں حقیقی فرق موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

’’ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں، اول عقائد (جیسے: توحید ونبوت وغیرہ) سو اس میں تو سب دین والے شریک اور موافق ہیں، اختلاف ممکن ہی نہیں۔ دوسرے قواعدِ کلیہ شریعت کہ جن سے جزئیات وفروعی مسائل حاصل ہوتے ہیں، اور تمام جزئیات میں وہ کلیات ملحوظ رہتے ہیں، اور ملت فی الحقیقت انہی اصول اور کلیات کا نام ہے، اور ملتِ محمدی اور ملتِ ابراہیمی کا توافق واتحاد انہی کلیات میں ہے۔ تیسرے مجموعۂ کلیات وجزئیات وجمیع اصول وفروع، جس کو شریعت کہتے ہیں، جس ۱۳ کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ایک ہے اور شریعت جدا جدا۔‘‘ (۱۳)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ کی ترجیح

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ توجیہ دوسری توجیہات کی بنسبت زیادہ دقتِ نظری پر مبنی ہے، جس

کے مطابق اگر چہ ''دین''، ''ملت'' اور ''شریعت'' کے مصداق میں بعض اجزاء میں اشتراک پایا جاتا ہے، تاہم باعتبارِ اطلاق ان کے درمیان حقیقی فرق موجود ہے، چنانچہ عقائد- جن میں تمام ادیانِ سماویہ مشترک ہیں- پر ''دین'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اصول وقواعد کلیہ- جو ابراہیمی ومحمدی ملت میں مشترک ہیں- پر ''ملت'' کا اطلاق ہوتا ہے، اور اصول وقواعد اور جزئیات وشرائع کے مجموعہ پر ''شریعت'' کا اطلاق ہوتا ہے، جو ہر رسول کو الگ الگ عطا کی گئی ہے۔ یہ توجیہ نصوصِ قرآنیہ کے بالکل موافق ہے، ملاحظہ ہوں:

سورۂ شوریٰ کی آیت کریمہ ''شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ۔'' (الشوریٰ:۱۳) میں تمام انبیاء کا دین ایک قرار دیا گیا ہے۔

متعدد آیات میں امت محمدیہ کو ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، جیسے: ''فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا۔'' (آل عمران:۹۵)

سورۂ مائدہ کی آیت ''لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔'' (المائدۃ:۴۸) میں صراحۃً انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کو مختلف قرار دیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱:......معجم مقاییس اللغۃ، لابی الحسین احمد بن فارس، متوفی: ۳۹۵ھ، مادہ: دَیَنَ، ج:۲، ص:۳۸۰۔
۲:......اساس البلاغۃ، لابی القاسم محمود بن عمرو الزمخشری، جار اللہ، متوفی: ۵۳۸ھ، ج:۲، ص:۲۲۸۔
۳:......المحکم والمحیط الاعظم، لابی الحسن علی بن اسماعیل بن سیدہ، متوفی: ۴۵۸ھ، ج:۱۰، ص:۳۷۸۔
۴:......لسان العرب، لابن منظور الافریقی، متوفی: ۷۱۱ھ، ۸، ص:۱۷۵۔
۵:......معجم الفروق اللغویۃ، لأبی ہلال الحسن بن عبداللہ العسکری، متوفی: نحو ۳۹۵ھ، ج:۱، ص:۵۱۰۔
۶:......التوقیف علی مہمات التعاریف لزین الدین محمد المناوی، متوفی: ۱۰۳۱ھ، ج:۱، ص:۱۶۹۔
۷:......مجموع الفتاوی، لابی العباس احمد بن عبدالحلیم بن تیمیۃ الحرانی، متوفی: ۷۲۸ھ، ج:۱۹، ص:۳۰۶۔
۸:......کشاف الاصطلاحات تھانوی، ج:۲، ص:۹۵۷۔
۹:......مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ لدکتور/محمد سعد الیوبی، ص:۳۳۔
۱۰:......معجم الفروق اللغویۃ لابی ہلال الحسن بن عبداللہ العسکری، متوفی: نحو ۳۹۵ھ، ج:۱، ص:۵۱۱۔
۱۱:......معجم الفروق اللغویۃ، لابی ہلال الحسن بن عبداللہ العسکری، متوفی: نحو ۳۹۵ھ، ج:۱، ص:۵۱۰۔
۱۲:......کتاب التعریفات، لعلی بن محمد الشریف الجرجانی، متوفی: ۸۱۶ھ، ج:۱، ص:۱۰۵۔
۱۳:......تفسیر عثمانی، البقرۃ، آیت: ۱۳۵، حاشیۃ: ۶۔

(جاری ہے)

جامعہ کے استاذ حضرت مولانا مفتی محمد نیاز رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت

محمد اعجاز مصطفیٰ

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے استاذ و ناظم دارالاقامہ حضرت مولانا مفتی محمد نیاز صاحب رحمۃ اللہ علیہ یکم محرم الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۲ ستمبر ۲۰۱۷ء بروز جمعہ حرکتِ قلب بند ہونے سے راہیِ سفرِ آخرت ہوگئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ما أعطٰی وکل شیء عندہٗ بأجل مسمّٰی۔

مفتی محمد نیاز صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۵ فروری ۱۹۷۲ء کو ضلع اَٹک تحصیل حضرو علاقہ چھچھ کے گاؤں شینکہ میں نیک دل و نیک صفت انسان جناب محمد یونس صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔

۱۲ سال کی عمر میں قریبی گاؤں ملک مالا میں قاری اسماعیل صاحب کے پاس حفظ مکمل کرلیا۔ اس کے بعد ساتویں جماعت تک اسکول کی تعلیم وہیں گاؤں میں حاصل کی۔

دینی تعلیم کے لیے مفتی صاحب خود اور اُن کے گھر والے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ کے خواہشمند تھے۔ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے مہتمم ثانی امام اہل سنت حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن قدس سرہٗ اپنے گاؤں بہبودی ضلع اٹک تشریف لائے ہوئے تھے، موقع جان کر مفتی صاحب کے بھائی حاجی محمد ابراہیم صاحب نے ان سے داخلہ کی سفارش کی درخواست کی، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے لیٹر پیڈ پر خود ان کی درخواست اور سفارش لکھی اور سفارشی درخواست پر ایک جملہ بھی لکھا تھا کہ: ''درخت لگانا ہمارا کام، اس کو پھل دار بنانا اللہ کا کام ہے۔''

۱۹۸۸ء میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن داخلہ کی غرض سے آئے۔ حضرت مفتی احمد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے سے جامعہ کی شاخ جامعہ عربیہ اسلامیہ ملیر میں درجہ اولیٰ میں داخلہ دیا گیا۔ درجہ اولیٰ سے درجہ رابعہ تک ملیر شاخ میں پڑھتے رہے، پھر درجہ خامسہ میں مرکز آگئے۔ درجہ سابعہ کے

بعد تکمیل وغیرہ کے لیے سوات چلے گئے، ایک سال تک مختلف علوم وفنون میں تکمیل کی، پھر دورہ حدیث کے لیے اگلے سال جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں واپس آ گئے۔ ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۹۹۷ء آپ کا فراغت کا سال ہے۔ درسِ نظامی سے فراغت کے بعد دو سالہ تخصص فی الفقہ کیا۔ تخصص سے فراغت کے بعد تخریج فتاویٰ کے شعبہ میں تقرر عمل میں آیا۔ بعد میں تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی عبدالسمیع شہید رحمہ اللہ کی شہادت کے بعد سے تادم آخریں افریقی (غیر ملکی) دارالاقامہ کے ناظم بھی رہے۔ دو سال قبل جامعہ کے دارالافتاء میں بطور معین مفتی بھی تقرر ہوا اور باقاعدہ دارالافتاء میں نشست دی گئی۔

مفتی صاحب انتہائی سنجیدہ، باوقار، نیک سیرت، تہجد گزار شب زندہ دار انسان ہونے کے ساتھ ساتھ دوستوں میں گھل مل جانے والے انسان تھے۔ طلبہ کی نگرانی اور ان کی تعلیم کے لیے ہمہ وقت فکر مند اور ان پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ غیر ملکی طلبہ اپنی امانتیں حضرت مفتی صاحب کے پاس ہی رکھواتے تھے، جن کی نگہداشت وحفاظت مفتی صاحب اہتمام سے فرماتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے چار بھائی ہیں، چاروں ماشاء اللہ! بقیدِ حیات ہیں، مفتی صاحب ان سب سے چھوٹے اور پانچویں نمبر پر تھے۔ والدہ حیات ہیں، والد صاحب کا انتقال ۱۹۹۶ء میں ہوگیا تھا۔ پسماندگان میں ایک اہلیہ، چار صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادہ ہے۔

یکم محرم ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۲ ستمبر ۲۰۱۷ء بروز جمعہ، جمعہ کی نماز سے قبل دل کا دورہ پڑا، علاج معالجہ کی غرض جناح اسپتال جاتے ہوئے راستے میں ہی آپ کی وفات ہوگئی۔ وفات کی اطلاع ملتے ہی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ کرام جناح ہسپتال پہنچے، اور مفتی صاحب کے جسدِ خاکی کو جامعہ لے آئے۔ عصر کی نماز سے قبل جامعہ میں ہی غسل اور تکفین کا عمل مکمل ہوا۔ عصر کی نماز سے قبل ان کی میت دیدارِ عام کے لیے درجہ سابعہ کی کلاس میں رکھی گئی۔ شہر بھر سے ان کے شاگردوں، ساتھیوں، علمائے کرام اور محبین نے زیارت کی۔ عصر کی نماز کے بعد پہلی نمازِ جنازہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہٗ کی اقتداء میں ادا کی گئی۔ جنازہ میں کثیر تعداد میں طلبہ کرام، اساتذہ کرام اور شہر بھر کے علماء اور عوام الناس شریک ہوئے۔ بعد ازاں ان کی میت بذریعہ جہاز اسلام آباد اور پھر رات ایک بجے اسلام آباد پہنچنے کے بعد بذریعہ ایمبولینس آبائی علاقہ حضرو ضلع اَٹک روانہ کی گئی۔ میت کے ہمراہ اہل خانہ کے علاوہ حضرت مولانا طلحہ رحمانی صاحب، حضرت مولانا مفتی رفیق احمد بالاکوٹی صاحب اور حضرت مولانا سعید خان اسکندر صاحب بھی ان کے آبائی گاؤں تک ساتھ گئے۔

آبائی گاؤں پہنچنے کے بعد دوسری نمازِ جنازہ ظہر کی نماز کے بعد جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے استاذ مفتی رفیق احمد بالاکوٹی صاحب کی اقتداء میں ادا کی گئی، جس میں ہزاروں افراد شریک ہوئے۔ اپنے علاقہ کے اعتبار سے یہ بہت بڑا جنازہ تھا۔ صوبہ کے پی کے، ہزارہ ڈویژن اور پنجاب سے کثیر تعداد میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے فضلاء، علماء اور دینی وسیاسی جماعتوں کے ذمہ داران شریک ہوئے۔ جنازہ میں طلبہ کی شرکت کے لیے قریب کے مدارس میں چھٹی کردی گئی، چنانچہ علاقہ کے مدارس کے طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد بھی جنازہ میں شریک ہوئی۔ جنازہ سے پہلے اور جنازہ کے بعد مولانا عبدالغفار صاحب مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ فریدیہ اسلام آباد اور مفتی رفیق احمد بالاکوٹی استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے بیانات بھی ہوئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مولانا مفتی محمد نیاز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کی جملہ حسنات کو قبول فرمائے، انہیں جنت الفردوس کا مکین بنائے، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ماہنامہ ''بینات'' باتوفیق قارئین سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایصالِ ثواب کی استدعا کرتا ہے۔

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

''کوشر'' یہودی کھانا

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

میری بیٹی بنام اسماء اپنے اہل وعیال کے ساتھ امریکہ میں عرصۂ دراز سے قیام پذیر ہے، وہ آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتی ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱:......کیا کوشر (Kosher) جو معروف یہودی کھانا بتایا جاتا ہے، ایک مسلمان کے لیے شرعاً جائز ہے؟ اگر ہے تو اسلامی رو سے کیا دلیل ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیا وجہ ہے؟

۲:......حلال اور ذبیحہ میں کیا فرق ہے؟

لغت کی رو سے حلال حرام کا متضاد ہے اور جائز درست ذبح کیا ہو۔

لغت کی رو سے ذبیحہ یعنی قربانی کا جانور جو شرعی طور پر ذبح کیا ہو۔

آپ سے استدعا ہے کہ دونوں سوالوں کا جواب عنایت فرما کر ہمیں سرفراز فرمائیں۔

مستفتی: نسیم حضرت جی

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

واضح رہے کہ ''کوشر'' یہودیوں کے ہاں ان کے مذہب کے مطابق اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس معنی میں ہم ''حلال'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ''کوشر ذبیحہ'' حلال کردہ جانور کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کو ہم ''حلال ذبیحہ'' بھی کہتے ہیں۔ یہودیوں کے ذبیحہ کا حکم یہ ہے کہ: اگر یہودی اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق ذبح کرنا جانتا ہو اور اس کا التزام بھی کرتا ہو، بالخصوص! اللہ کا نام لے کر اچھی طرح رگوں کو کاٹ دے تو اس کا ذبیحہ اُصولِ مذہب کے مطابق اہل کتاب کا ذبیحہ ہونے کی بنا پر حلال ہوگا۔ البتہ موجودہ دور کے اکثر یہود ونصاریٰ حقیقی معنوں میں اپنی کتابوں کی تعلیمات سے واقف ہوتے ہیں، نہ ہی اپنی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق عمل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، بلکہ اکثر مادہ پرست اور

دہریہ نظریات کے حامل ہوتے ہیں، جس کی بنا پر اُنہیں اہل کتاب شمار کرنا مشکل ٹھہرتا ہے، اس لیے ان کا ذبیحہ مطلقاً حلال نہیں ہوگا، بلکہ کم از کم مشتبہ ٹھہرتا ہے، لہٰذا ان کے ذبیحہ سے احتراز کیا جائے۔

فی القرآن الکریم:

''وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ''۔ (المائدۃ:۵)

وفی التنویر:

''وشرط کون الذابح مسلمًا أو کتابیًا ذمیًا أو حربیًا۔'' (ج:۶،ص:۲۹۷،ط:سعید)

وفی الشامیة:

''ومقتضی الدلائل الجواز (ذبیحة أهل الکتاب) کما ذکره التمرتاشی فی فتاواه، والأولی أن لایأکل ذبیحتهم ولایتزوج منهم إلا للضرورة کما حققه الکمال بن الهمام۔'' (فتاویٰ شامی، ج:۶،ص:۲۹۷،ط:سعید)

وفی التفسیر المظهری:

''روی ابن الجوزی بسنده عن علیؓ قال: لاتأکلوا من ذبائح نصاریٰ بنی تغلب فإنهم لم یتمسکوا من النصرانیة بشیٔ إلا شربهم الخمر، رواه الشافعیؒ بسند صحیح عنه۔'' (تفسیر مظہری، ج:۳،ص:۳۴)

۲:......واضح رہے کہ ''ذبیحہ'' ہر اس حیوان کو کہا جاتا ہے جس کو ذبح کیا جائے، پھر اگر اس کو شرعی طریقہ پر ذبح کیا جائے' اس کو ''حلال ذبیحہ'' کہا جاتا ہے۔ اور اگر اس کو شرعی طریقہ پر ذبح نہ کیا جائے تو اس کو ''مردار'' اور ''حرام ذبیحہ'' کہا جاتا ہے۔

قربانی کو عربی لغت میں ''اُضحیہ'' کہا جاتا ہے، نہ کہ ''ذبیحہ''، اور ''اُضحیۃ'' اس مخصوص حیوان کو کہا جاتا ہے، جس کو مسلمان عیدالاضحیٰ کے ایام میں ذبح کرتے ہیں۔ الدرالمختار میں ہے:

''الذبیحة اسم ما یذبح۔'' (الدرالمختار، ج:۶،ص:۲۹۳،ط:سعید)

وفی التنویر مع شرحه:

''حرم حیوان من شأنه الذبح مالم یذک ذکاءً شرعیًا اختیاریًا کان أو اضطراریًا۔'' (ج:۶،ص:۲۹۴،ط:سعید)

وفیه أیضاً:

''هی (الأضحیة) لغةً اسم لما یذبح أیام الأضحی۔'' (ج:۶،ص:۳۱۱،ط:سعید)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہٗ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد عبدالقادر	ظہور اللہ
		متخصص فقہ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

نَقدُ ونظَر

ادارہ

دار العلوم حقانیہ اور ردِ قادیانیت

ترتیب وتدوین: مولانا انعام الرحمٰن شانگلوی ومولانا محمد اسرار مدنی۔ باہتمام ونگرانی: حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم، صفحات: ۶۱۰۔ قیمت: درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: مؤتمر المصنفین، دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک۔

عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لیے جو قربانیاں تمام مسالک سے وابستہ پاکستانی علمائے کرام اورعوام الناس نے دی ہیں وہ تاریخ کا سنہری باب ہیں، خصوصاً قومی اسمبلی کے فلور پر حضرت مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، حضرت مولانا مفتی محمود، حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی، حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی، پروفیسر عبدالغفور جیسے اکابر کی شب وروز محنت اور جد وجہد ہی کا ثمرہ ہے کہ نوے سالہ پرانا مسئلہ ان اکابر کی قیادت میں حل ہوا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر دے حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کو کہ انہوں نے اُس وقت کی تمام تحریری یادداشتیں اور مواد کو محفوظ اور سنبھال کر رکھا کہ آج کتاب کی صورت میں بہت ہی قیمتی سرمایہ قارئین تک پہنچ رہا ہے، مرتبین نے کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے:

بابِ اول: تحریک ختم نبوت ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۳ء۔ بابِ دوم: تحریک ختم نبوت ۱۹۷۱ء۔ بابِ سوم: تحریک ختم نبوت ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۴ء۔ بابِ چہارم: مولانا سمیع الحق کا سوال نامہ اور مشاہیر عالم اسلام کے جوابات۔ بابِ پنجم: وفاقی مجلسِ شوریٰ اور سینیٹ میں تعاقب۔ بابِ ششم: منبرِ حقانیہ سے دفاعِ ختم نبوت۔ بابِ ہفتم: ردِ قادیانیت اور ماہنامہ ''الحق''۔

زیرِ تبصرہ کتاب' ردِ قادیانیت اور دفاعِ ختم نبوت جیسے حساس مسئلہ کے حوالے سے دلائل سے بھرپور، آئینی وقانونی مباحث سے مزین ایسا مجموعہ ہے جو کہ علمائے کرام، پاکستانی عوام اور خصوصاً کارکنانِ مجلسِ تحفظِ ختم نبوت کے لیے یکساں مفید اور نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ امید ہے باذوق حضرات اس نایاب جوہر کی خوب قدر افزائی فرمائیں گے۔

خاتونِ جنت حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا

مولانا حافظ محمد اقبال رنگونی صاحب۔صفحات: ۵۶۰۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ادارہ اشاعتِ اسلام، مانچسٹر۔ پاکستان میں ملنے کا پتہ: صدیقی ٹرسٹ: ۴۵۸، گارڈن ایسٹ، نز دلسبیلہ چوک، کراچی۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ نے اسلامی عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تمام اہل بیت نبویؐ اور ازواجِ مطہراتؓ کی محبت، عظمت اور حرمت عین ایمان اور اسلام ہے۔ صحابہ کرامؓ نجوم ہدایت ہیں اور اہل بیت نبویؐ کی محبت سفینۂ نوحؑ ہے۔الحمد للہ! اہل سنت سفینۂ نوحؑ میں سوار ہوئے اور نجوم ہدایت کی راہنمائی میں اپنا سفر طے کیا اور منزلِ مقصود کو پہنچ گئے۔''

خاتونِ جنت سیدہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی اور لاڈلی صاحبزادی تھیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب آپؓ کی سیرت اور سوانح پر مشتمل ہے، جس میں آپؓ کی سیرت کے علاوہ آپؓ کی بہنوں اور آپؓ کے صاحبزادوں سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما اور سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا تذکرہ بھی ملے گا۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارہ میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بھی اُجاگر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ محبتِ اہل بیتؓ کی آڑ میں جن لوگوں نے صحابہ کرامؓ پر زبانِ طعن دراز کی ہے ان کی حقیقت بھی واشگاف کی گئی ہے۔

جمعہ کے معمولات

مولانا راشد علی نواب شاہی۔صفحات: ۱۷۱۔ قیمت: درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: ملتزم پبلشرز، کراچی۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں جمعہ کے فضائل، احکام، آداب اور اعمال کو عمدہ انداز میں مستند اور معتبر حوالوں کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی کے دعائیہ کلمات اور مولانا مفتی عبد الرؤف سکھروی صاحب کی تصدیق اس کتاب کی ثقاہت کی دلیل ہے۔امید ہے اس کتاب کی پذیرائی کی جائے گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت صوفی اشفاق اللہ واجد مجددی دامت فیوضہم۔صفحات: ۴۰۱۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ سراجیہ، گوجرہ، ضلع ٹوبہ۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامع الکمالات ہے، آپؒ ایک عظیم فقیہ، بلند پایہ مجتہد، مفسر، بے مثل اُصولی اور متکلم کے علاوہ عابد، متقی، مجاہد فی سبیل اللہ اور عظیم مدبر تھے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے احوال وآثار، مناقب اور فضائل ومعارف کے علاوہ تدوینِ فقہ حنفی کے شرکاء کے مختصر حالات، امام صاحبؒ کے مناظرے، امام صاحبؒ کے عہد میں باطل فرقے، فقہ کے ۹۷ اُصول، امام صاحبؒ کے ملفوظات اور وصایا کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔کتاب کی ابتداء میں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب مدظلہٗ کی تقریظ کتاب کی ثقاہت کی دلیل ہے۔